إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۱۳۷)

کتاب مستطاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یعنی

سوانح اقدس حضرت سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

جلد ہفتم

مشتمل بر معاملات

...رم کے چند متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ

...... ہ تالیف ...... ہ

...مان ندوی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی سنہ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء

...نع کرکے مطبع معارف اعظم گڈھ طبع گردید

طبع ششم — سنہ ۱۴۰۲ھ — مہتمم سید اقبال احمد

فہرست مضامین

سیرۃ النبی جلد ہفتم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

وخاتم النبیین محمد وآلہ وصحبہ اجمعین ط

سیرۃ النبی بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں کی بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاعِ گرانمایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں، بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و دیدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مرادف ہے ؎

مادح خورشید مداح خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انھوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ وسلام کی سیرت طیبہ، حالات و واقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدیؐ، تعلیمات نبویؐ اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے، انھوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلیؒ کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے، دلائل و معجزات اور منصب نبوت (عقائد، عبادات اور اخلاق) کو بھی اسی کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثت محمدیؐ اور سیرت نبویؐ کی وسعت و جامعیت،

اس کی بے خطا رہبری و رہنمائی اور ہر عہد میں حیات انسانی و نسلِ آدم کے لئے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئی تعلیم یافتہ نسل کے لئے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذاتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحبؒ کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا، اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبویؐ پر ایک "دائرۃ المعارف" (انسائیکلوپیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتابِ زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے لیکن انھوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور نقشہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلۂ سیرۃ النبی کی تکمیل ہو جاتی بلکہ انکے علمی اور ذہنی کمالات، وسعتِ نظر، جامعیت، اعتدال و توازن، احتیاط و تورع، شریعتِ اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی، قدیم و جدید کی واقفیت، دین کے اولین و مستند ترین ماخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ اُن میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اُس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی کی بہتر سے بہتر مجتہدانہ اور ترجمانی ہوتی، افراط و تفریط سے پاک، تجدد و آزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی، اور اس میں اُن صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنۂ جواب رہتے ہیں، اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گذشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت

ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیاتِ مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی، قلم میں خطباتِ مدراس اور سیرۃ النبیؐ کی جلد سوم چہارم و پنجم و ششم کا زور اور آبشارِ علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بناء پر دار المصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہر وقت موقع اور فراغِ خاطر باقی نہیں رہا تھا، اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل و غیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا، لیکن ایک بصیر و ماہر فن اور ایک استاد و کہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سیکڑوں صفحات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتابوں کا خلاصہ اور حاصلِ مطالعہ ہوتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو، اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرۃ النبیؐ کے میخانے کے بادہ خوار اور سید صاحب کی تحریرات و تحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد ہفتم کے لئے جو متفرق مضامین و مباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالت میں کسی طرح زیورِ طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبیؐ کی چھ جلدوں کے قارئین و مشتاق اپنی پیاس بجھاتے، اور اپنے قلب و نظر کو روشن کرتے، خدا کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ناظم دار المصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی موقع ملا، اور انھوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم کے نام سے شائع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے، لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے، اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نچوڑ، اور فکر و نظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم

کتابوں میں نہیں ملیں گے، ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں مبتلا ہوگئے ہیں، اور انھوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کرلیا ہے، اس لئے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہوگیا، اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا، اس لئے ان کو اس راہ میں عرصہ تک تردد رہا، مقدمہ میں فرماتے ہیں:

"اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاقِ حال تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاط ہو، مگر باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جس میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے، اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علماء کی کتابیں قطعاً اکثر خالی ہیں، اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے[1]۔"

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

"اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار ہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز ۲ر جمادی الثانی ۱۳۵۹ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا، دو سال کے بعد ۲۹ر رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا، اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴ر شعبان ۱۳۶۳ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پہ چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا، اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ عزم درست کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ہے[2]۔"

---

[1] سیرۃ النبی ج ۶، مقدمہ ص ۵ [2] ایضاً ص ۱۔

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آ گئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آ سکتی ہیں، مثلاً اس کتاب میں "معاملات" کی تعریف، اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے، "میزان" کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کی آیات کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے، سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے، (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور وحدت مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکز ارشاد سے تعلق تھا، وہ نہ صرف سیاست و حکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح و تربیت کے لیے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا، ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فطری امتیازات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت و سلطنت اور دنیاوی سیاست ہے، یہاں تک کہ کتاب و نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔"[1]

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بینات بھی جمع کر دی ہیں، اور یہ سیرت نبوی کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس کی طاقت ان کا قلم پکڑ لیتی ہے اور ان کے قلم سے حسبِ ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

"معلوم ہے کہ اسلام کے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام، حقوق و فرائض اس کے لئے بمنزلۂ تمہید تھے،

[1] مقدمہ: ص ۲۳

بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکے۔ اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے[1]:

اور اس کی تائید کے لئے وہ سورۂ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرنے پر خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن و امان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفہ اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو دین و سیاست کی تفریق کی قائل تھی اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبال نے سچ کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری

اس لئے خطباتِ مدراس اور رسولِ وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ:

"اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں، ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے، وہی آسمان پر حکمران ہے،

[1] مقدمہ۔ ص ۷۴

وہی زمین پر فرماں روا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۔ — اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔۱؎

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر بھی وسیع اور گہری نظر ہے اور انھوں نے دیکھا ہے کہ کس طرح خلافتِ اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ نیز وہ موجودہ دور کے قیامِ حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں، اس لئے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ :

"اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے، نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ نہ جاہ و منصب کا فریب نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے، بلکہ سر تا سر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لئے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔"۲؎

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے، اگر اس میں سیاسیات اور نظمِ حکومت کا پورا حصہ آ جاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین طریقے پر پُر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفوں کی سحر انگیزی اور ان کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے، لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنی جگہ پر نادر و نایاب ہے۔ نقشِ سلیمانی ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور ہوتا ہے۔

آثارِ قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگارِ نبوی، متکلمِ اسلام اور نابغۂ عصر استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی کی شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبی کی کسی جلد پر یہ گمنام پیش لفظ لکھے، لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے، اس لئے اس پر ایک ناقص کا کچھ لکھنا محلِ تعجب نہیں کہ ؎

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ
۲۸ / مئی ۱۹۸۰ء

ابو الحسن علی ندوی
۱۱ / رجب سنہ [illegible]

۱؎ منشور ص ۴۹ ۲؎ ایضاً ص ۶۳

اظہارِ عجز

من وشبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی
کہ محرم نیست غمور از لب، در گفت وگوئے تو

دار المصنفین، اعظم گڈھ
۲۳؍شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ، ۷؍جولائی ۱۹۸۰ء

ہیچمدان مورِ سلیمان
سید صباح الدین عبدالرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ الطاہرین

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

معاملات کے حدود معاملات کا اطلاق فقہا نے حقوقِ عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے، مثلاً بعض فقہائے شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے، یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے، اور یا امور دنیا سے ان کا تعلق ہوگا، تو ان کی تین قسمیں ہیں، اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دنیا سے متعلق ہیں اشخاص کی بقا مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید و فروخت و اجارہ و رہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقا مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح و طلاق و خلع و تفریق وغیرہ) اور اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقا ہے

تو ان کو عقوبات کہیں گے[1] (جیسے قصاص و سزا و تعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی جن پر دین و دنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین و دنیا میں فساد راہ پائے گا، اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، یہ قسمیں کی ہیں **عبادات** جیسے نماز، روزہ وغیرہ اور **معادات** جیسے ماکولات، مشروبات، ملبوسات اور مسکونات کے احکام، اور تیسری **معاملات** ہے، جس سے مقصود نسل و نفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی **جنایات** ہے، جس سے مقصود وہ احکام ہیں جن کا اجرا اس شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے۔ جیسے قصاص و حدود و تعزیرات۔

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن عابدین نے بحر الرائق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، مزاجر اور آداب۔ اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر منقسم ہے معاوضات مالیہ (بیع و فروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح و طلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر، یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے، اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتل نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبرو ریزی پر زجر، کسی کی بدعہدی پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

---

[1] کشاف، اصطلاحات الفنون احمد تھانوی مطبوعہ کلکتہ ۱، ص ۲۴۳ بحوالہ توضیح و تلویح۔

معاملات سے ہماری مراد | لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکام شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوق عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں، اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی، یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔

آبادی و مملکت جس کا قانونی نام مدنیہ ہے، اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے۔ لیکن ہمارے قدیم فقہاء نے اس کے لئے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمد، اس میں امارت، خلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آجاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے۔ جیسے الاحکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی سنہ ۴۵۰ھ اور الاحکام السلطانیہ قاضی ابویعلی حنبلی المتوفی سنہ ۴۵۸ھ لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ و خراج و زکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ اور اسی لئے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال یا کتاب الخراج رکھا ہے۔ جیسے کتاب الاموال ابو عبید بن سلام المتوفی سنہ ۲۲۴ھ، اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف المتوفی سنہ ۱۸۲ھ، اور کتاب الخراج یحییٰ بن آدم القرشی المتوفی سنہ ۲۰۳ھ۔ اہل سنت کے نزدیک گو امامت اصول عقائد میں سے نہیں ہے، تاہم اس کے ضروری ابحاث کتب عقائد کے خاتمہ میں

ذکر کر دیئے جاتے ہیں، جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب، اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرز بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے لئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی، اسی لئے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی، اور مباحث میں رد و بدل اور نئی ضرورتوں کے لئے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت، مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے، دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانونوں پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زاید افراد یا پوری جماعت کے قانونی حقوق کی تشریح ہو اور ان کے ضابطوں اور قانونوں کی تفصیل ہو، ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مباحث کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہو سکتی ہیں معاشرت، اقتصادیات، اور سیاسیات، اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہو سکتے ہیں، اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے۔ معاشریات میں نکاح و طلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی، اقتصادیات میں تمام مالی و تجارتی کاروبار کا بیان آ جائے گا، اور سیاسیات میں حکومت و سلطنت اور اس کے

متعلقات مذکور ہوں گے۔

اس کام کا اشکال یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کو مختلف الابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں، اور فقہاء نے فقہ کے متعدد ابواب میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے، اس لئے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا، مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے، بلکہ اولی ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے، اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گذرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے، اور خصوصاً اس لئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متنوع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلق اصولی نظریئے سے قدماء کی کتابیں نصاً اکثر خالی ہیں، اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔ مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبوی کے سیاسیات کے احکام و فرائض کا ماخذ خود ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے، یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی، اور بالآخر

قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گو ۷ رجمادی الثانیہ سنہ ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا، لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیئے، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان سنہ ۱۳۶۲ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا اور پھر رک جانا پڑا۔ ۲۴ رشعبان سنہ ۱۳۶۳ھ کو پھر قلم اپنے اس سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا، لیکن چند ہی قدم چل کر رک جانا پڑا۔ اب یکم رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۶ھ کو دوبارہ عزم و رسعت کے ساتھ چلنے کی تیاری ہے، مگر انجام عالم الغیب کو معلوم ہے۔

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي (طٰہٰ)

دیگر مذاہب اور معاملات

دنیا کے مذاہب نے معاملات کو اپنی تعلیم کا حصہ بنانے میں مختلف رجحانات ظاہر کیے ہیں، تورات میں وہ مذہبی قوانین کا ضروری اور اہم جزو ہے لیکن عیسائیت نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ہندوستانی مذہبوں میں بھی دو مختلف قسمیں نظر آتی ہیں، عام ہندوؤں میں منوشاستر اور اس کی مختلف تشریحیں انہی معاملات کی شاخیں ہیں، مگر شاید بودھ مت نے اخلاق ہی کو بڑھا کر قانون بنانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم یہ سب قومیں اپنے قانون کا ماخذ علم الٰہی اور علم مافوق انسانی کو قرار دیتی ہیں۔

معاملات کے ماخذ

دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جنھوں نے اپنے قانون کی بنیاد وحی الٰہی کے بجائے عقل انسانی پر رکھی ہے اور انسانی تجربہ و قیاس کو اپنے قانون کی اساس بنایا ہے، اور کہیں صرف سردار یا بادشاہ کی شخصی خواہش اور میلان طبع قانون کا سرمایہ ہے، کہیں شخص نے جمہوریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور افراد کی کثرت اور قلت اور کسی طرف ووٹ دینے والوں کی تعداد کی کمی اور بیشی کو صحت اور غلطی، صواب اور خطا اور حق و باطل کا

معیار بنایا گیا ہے، یہ افراد و ارکان مختلف اداروں سے چنے جاتے ہیں اور مختلف فرقوں سے منتخب ہوتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ذاتی ہوا و ہوس نہ ہو تو بھی فرقہ دارانہ ہوا و ہوس، اور جماعتی تعصب اور فرقوں کا نفع و نقصان قوانین جمہور کی بنیاد قرار پاتا ہے۔ اور جمہوریت کے لباس میں شخصیت اور فرقہ واریت صرف اپنے نفع کی خاطر جمہوریت پہ حکم نافذ کرتی ہے اور جمہور کو اس کا پابند بناتی ہے۔

قانون سازوں کی بیچارگی

اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی قوم اور غیر قوم امیر اور غریب، سرمایہ دار اور مزدور، تجارت پیشہ اور زمیندار، طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں، جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں، جب کوئی تجویز معرض بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطۂ نظر سے نہیں، بلکہ ملک، قوم، جماعت، طبقہ اور پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اور اس کو جمہور کے لئے آیۂ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی ناکامی

اس جوش و خروش اور حجت اور دلیل سے جو تجویز آیۂ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ ایک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے، پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے، اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی، آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے۔ اور تیسری اور چوتھی، اور پانچویں آتی ہے، اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے، ان تمام

تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا ادل بدل اور تغیر ہے ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہونچتا، یا ایک کو پہونچتا ہے دوسرے کو نہیں تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے، اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے، اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گذر جاتی ہے اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

صحیح و عادلانہ قانون سازی کی انسانیت کو ناچاری

ان تغیرات کے باوجود جو قانون بنتا ہے، چونکہ وہ صرف ظاہری طاقت پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوتا، اس لیے قدم قدم پر اس کے چلانے والے کے ذاتی مفاد سے وہ ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص و طمع، غرور و تکبر، ہوا و ہوس رشوت اور انتفاع ناجائز، خوف و ہراس اور مکر و حیلہ کے بیسیوں خلاف انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف کی میزان ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔

قانون الٰہی کی ضرورت

اسی سبب سے مصلحت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل و انصاف کی یہ میزان خود دست الٰہی میں ہو .... کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں، وہ سب کا ہے اور سب کے لیے ہے، اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے، جس کو اپنے لیے اور اپنی غرض کے لیے کچھ نہیں چاہیے، جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک

اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں، جاری کر رکھا ہے، اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں جاری فرمائے، جو تمام تر عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

اَللّٰہُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ	اللہ وہ ہے جس نے اتارا ہے کتاب کو
وَالْمِیْزَانَ (شوریٰ-۲)	ساتھ حق کے اور ترازو کو،
وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ	اتاری ہم نے ساتھ ان (نبیوں) کے کتاب
وَالْمِیْزَانَ (حدید ۳)	(قانون) اور ترازو،

کتاب اور میزان میزان سے مقصود یہ کاٹھ اور لوہے کی ترازو نہیں، بلکہ فطرت اور عدل و انصاف اور حق کی میزان ہے، جس سے سارا نظامِ کائنات تُل رہا ہے، اور سارے انسانی کاروبار اور اعمال تولے جاتے ہیں، چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

اَلرَّحْمٰنُ ٥ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ٥ خَلَقَ	رحمت والا (خدا) جس نے قرآن
الْاِنْسَانَ ٥ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ٥	سکھایا، انسان کو بنایا اور اس کو
اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ٥	گویائی سکھائی، سورج اور چاند حساب کے
وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ ٥	ساتھ ہیں، اور بے تنے کے درخت
وَالسَّمَآءَ رَفَعَھَا وَوَضَعَ	اور تنے دار درخت اس کے زیر فرمان
الْمِیْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا	ہیں، اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا

فِی الْمِیْزَانِ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ ٥	اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی تاکہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم
(رحمٰن ۱)	رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے، اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں، اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل، انصاف اور ظلم، صحیح اور غلط ہے، اس لئے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب، ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ دیکھو یہ قصد و ارادہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد وارادہ کے بغیر کس طرح عدل وانصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی احکام واصول کے مطابق چل رہی ہیں، اسی طرح قصد وارادہ کی دولت ونعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہیئے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد وارادہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے، قرآن پاک میں بار بار ہے

وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ	اور ناپ اور تول کو پورا
(انعام ۱۹)	کرتے رہو انصاف کے ساتھ
فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ۔	تو ناپ اور تول کو پورا
(اعراف ۱۱)	رکھو۔

اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ	ناپ اور تول کو پورا کرو،

(ہود - ۸)

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ	ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں،
وَالْمِيْزَانَ. (ہود - ۸)	

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید و فروخت کی اشیا بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں، لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں[1]، ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لئے ایک پیمانہ اور دوسرے کے لئے دوسرا پیمانہ چاہتا ہے، وہ اپنے لئے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لئے دوسری ترازو سے، اس ستم پیشہ پر خدا کی اور ساری دنیا کی پھٹکار۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ	پھٹکار ہے ان کم کردینے والوں کی
اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ	جو اپنے لئے لوگوں سے ناپ
يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ	پوری لیتے ہیں، اور جب ان کو
اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ.	ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم
(تطفیف ۱)	کر دیتے ہیں۔

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی

[1] تفسیر طبری میں آیات میزان سورۂ حدید اور سورۂ رحمان وغیرہ میں دیکھئے۔

حکمت کی تشریح ہے، چنانچہ سورۂ حدید میں زمین میں قیامِ عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ	اور ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ	نشانیوں کے ساتھ بھیجا، اور ان
وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ	پیغمبروں کے ساتھ کتاب اتاری
بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ	اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ
فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ	انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے
لِلنَّاسِ.	لوہا اتارا جس میں سخت ہیبت ہے
(حدید ۳)	اور لوگوں کے لئے کئی فائدے ہیں

اس آیت پاک میں عدل کے قیام اور ظلم کی روک تھام کے لئے تین چیزیں ارشاد فرمائی گئی ہیں، ایک کتاب، یعنی احکام الٰہی کا مجموعہ، دوسری چیز وہ فطری صحیح و عادلانہ میزان جو ہر صداقت شعار کے دل میں دھری ہے اور جس پر انسانی قانون کی بنیاد کھڑی ہے، اور تیسری چیز تلوار کی طاقت ہے جو ان دونوں کے ماننے پر ان کی گردنیں جھکا دیتی ہے، یعنی جو احکام الٰہی کے ماننے سے منکر ہیں اور جو اپنی فطرت کی صحیح میزان عدل کو توڑ چکے ہیں، ان کو پھر طاقت کے زور سے قانون کے ماننے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ آہنی آلہ جس کے ایک ہاتھ میں ہوتا ہے اس کا نام حکومت و ریاست ہے، اور اسی کے دوسرے ہاتھ میں قانونِ الٰہی کی کتاب بھی ہونی چاہئے

جس کے ماننے پر وہ اپنے ماتحتوں کو مجبور کرے۔

قانون الٰہی کی دائمی یکسانی

قانون الٰہی کے نظریہ پر ایک شبہہ یہ پیش ہوتا ہے کہ دنیا میں حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے انسانی معاشرت کے خاکے بھی بدلتے رہتے ہیں اور بدلتے رہیں گے، اس لئے قانون کو بھی بدلتا رہنا چاہیے، مگر یہ خیال سراسر فریب ہے، کیونکہ شے نہیں بدلتی، اس کے رنگ، شکل اور پہلو بدلتے رہتے ہیں، جس طرح مادیات کے اصول طبعی کبھی نہیں بدلتے (اِلَّا مَاشَاءَ اللہ) گرم چیز ہمیشہ گرم رہتی ہے، اور ٹھنڈی ٹھنڈی، آگ برف نہیں بنتی، برف آگ نہیں، روشنی تاریکی نہیں، تاریکی روشنی نہیں، زمانہ ہمیشہ بدلتا ہے، رات اور دن پے درپے آتے اور جاتے رہتے ہیں، گھنٹے گھڑی، پلک اور لمحے دم بہ دم بدل رہے ہیں، سال پر سال آتے ہیں، مگر چاند اور سورج وہی ہیں، ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں، جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب وگل کی دنیا پر حکمراں تھا، آج بھی وہی ہے، اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کرسکی، نہ چودھویں صدی، پہلے بھی سال کے بارہ شمسی اور قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں، کل بھی دن رات کے چوبیس ۲۴ گھنٹے تھے اور آج بھی ہیں۔

یعنی خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللہِ تَبْدِیْلاً۔ (فتح۔۲۳) خدا کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا

فطری حقوق و معاملات کی یکسانی

ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی و معاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں اُن میں نہ کبھی کوئی تغیر ہوا ہے نہ ہوگا، نیکی بدی نہیں بنتی، بدی نیکی نہیں، سچ جھوٹ نہیں ہوجاتا، جھوٹ سچ نہیں، ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا، دوسروں کی چیز ناحق لینا، چوری کرنا، ڈاکہ ڈالنا، دوسروں کی عزت اور آبرو کو داغ لگانا، دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا، حقِ قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا، کسی کی جائداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا، لین دین میں طرفین کی رضامندی، لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام، اخلاق سوز حرکات کی بندش، فتنہ و فساد کا انسداد، ظالمانہ طریقوں کی ممانعت ہر عہد میں، ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے، جب کبھی کوئی قانون بنا ہے یہی فطری دفعات قانون کے ضروری اجزاء رہے ہیں، اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزاء برقرار رہیں گے، البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لئے قانونِ الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام کے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے رہیں گے۔

قانون کا بنیادی تخیل

ہر مجموعۂ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جزر کی بنیاد ہوتی ہے، یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت، کہیں وطنی افادیت، کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے، اس لئے اُس مجموعۂ قانون میں اسی بنیادی

نقطۂ غرض کی لکیریں ابھری نظر آتی ہیں، جہاں قانون کی بنیاد قومی فوقیت ہے وہاں کالے گورے، یوریشین اور نیٹو کے اصول پر کارفرمائی ہے، جہاں وطن قانون کی اساس ہے وہاں جغرافی اقطاع عارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں، اور رومی اور غیر رومی، یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری، ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دئیے ہیں، یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ وار اختلاف کا بیج بوتا ہے، ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں اور بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے، بہاری یوپی میں جگہ نہیں پا سکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے۔ نیشنلزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے، اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور اطاعت کیلئے زمین سے فتنہ و فساد کا دفع، اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے،[1] چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود و تعزیرات ہیں اُن کا مقصد زمین سے فتنہ و فساد کا دفع ہے، اور جس قدر معاملات و معاشرت کے اصول اور مسائل ہیں، اُن کا مبنیٰ بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا

[1] علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد الاحکام فی مصالح الانام اور شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں۔

قیام ہے، اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں، ان سب کا منشا باہمی نزاع اور خدع و فریب کا استیصال ہے۔

اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف، زبان اور لغت اور تہذیب و تمدن کا کوئی فرق اور ملک و اقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے، یہ قانون خدا کا ہے، خدا کے سارے بندوں کے لئے بنایا گیا ہے، وہ چاہے کالے ہوں یا گورے، آریائی ہوں یا سامی، یورپی ہوں یا ایشیائی، ہندی ہوں یا حجازی، عجمی ہوں یا تاتاری، سب کے لئے یکساں اور سب کے لئے برابر ہے۔

ایک اصولی فرق

بے شبہہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس ...... کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں، اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہوجاتی ہیں، ایک وہ جو اس قانون کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں، یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدائے واحد و برحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں، مسلمان ہیں، دوسرے وہ جو گو اس خاص قانون الٰہی کو تو نہیں مانتے، لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الٰہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو، مانتے ہیں، ان کا نام ذمی ہے، لیکن ان کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جن کے پاس ان کا مانا ہوا قانون الٰہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفۂ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے، یہ کتابی ہیں اور دوم وہ جو اپنے قانون الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں، یہ شبہ کتابی ہیں، چوتھے وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفۂ الٰہی سے ناآشنا اور ہر قانون الٰہی سے محروم ہیں۔ ان کو

شرک کہتے ہیں ..... قانون الہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں، جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ **معاملات** کے حدود کیا ہیں اور ان کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں، تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لئے ایک عاملانہ طاقت و قوت کا وجود ضروری ہے جو ہر چیز کو احکام شرع اور نظام عدل کے مطابق قائم رکھے، اس بحث کے دو ضروری جزء ہیں۔

۱۔ اس عاملانہ طاقت و قوت کی ضرورت، حقیقت، اس کے شرائط و اوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

۲۔ معاملات انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ احکام، اور اس کے اسرار و مصالح۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے، آپ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوش خبری نہیں سنائی، بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی، تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف وخطر کی جا سکے اور اس کے لیے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	خدا نے ان سے جو ایمان لائے،
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	اور اچھے عمل کیے (یہ وعدہ کیا کہ)
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ	وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ	پہلے تھے اور ان کے لیے
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	ان کے اس دین کو جس کو اس نے
اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ	ان کے واسطے پسند کیا ہے، جما دے گا
بِيْ شَيْـًٔا ؕ	اور ان کو ان کی اس بے امنی کے
	بدلے امن دے گا، میری بندگی کریں گے،

(نور-۷) پھر کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لئے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے، تاکہ سارا حکم اسی ایک خدا کا ہو جائے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ	اور ان سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ
وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ.	فساد نہ رہے، اور سب حکم
(انفال-۵)	اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً	اے ہمارے پروردگار! ہم کو
وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا	بھلائی دے، اور آخرت میں بھلائی
عَذَابَ النَّارِ.	دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے
(بقرہ ۲۵)	بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم وعبادت، تندرستی، روزی، مال و دولت، فتح و نصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے، دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا	اور جنھوں نے نیک کام کئے ان کیلئے
حَسَنَةٌ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ	دنیا میں بھلائی ہے، اور آخرت کا

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ.	گھر سب سے اچھا ہے، اور
(نحل ۴)	پرہیزگاروں کا گھر کیسا اچھا ہے،

مقصود یہ ہے کہ نکوکاروں کے لئے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے اور آخرت کی بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔ جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی، ان کو بشارت ہے۔

فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا	تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور
وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ۔	آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۔	اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے
(آل عمران ۱۵)	

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے، جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا، اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ	اور جنھوں نے گھر چھوڑا خدا کیلئے
مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ	ستائے جانے کے بعد، ہم ان کو
فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَاَجْرُ	دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے،
الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ۔	اور بے شک آخرت کی مزدوری
(نحل ۶)	سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ۔ (اعراف۔۱۹)	اور (اے خدا) ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائدار ہے، اس لئے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو، ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تو دنیا تو مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا	جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں، اور کمی نہیں کی جاتی، یہ وہ ہیں جن کے لئے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں، اور

وَبٰطِلٌ مَّا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔	وہاں جو کیا تھا مٹ گیا، اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔
(ہود-۲)	
مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ۔	جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں، اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں،
(شوریٰ-۳)	
مَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَمَنْ یُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَۃِ نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَسَنَجْزِی الشّٰکِرِیْنَ۔	جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے، اور شکر گذاروں کو ہم پورا انعام دیں گے۔
(آل عمران-۱۵)	
مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعَاجِلَۃَ عَجَّلْنَا لَہٗ فِیْھَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِیْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَہٗ جَھَنَّمَ یَصْلٰھَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا۔	جو کوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں، پھر ہم نے اس کیلئے دوزخ کو بنایا ہے، وہ اس میں

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا.	داخل ہوگا برا ہوکر، دھکیلا جاکر، اور جو کوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کی اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔
(بنی اسرائیل ۲)	
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ	تو جو کوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا ثواب ہے۔
(نسار ۱۹)	

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے، حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہانوں کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے، لیکن جو آخرت کا طلبگار ہے اس کے لئے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں، لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی، مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لئے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْکًا عَظِیْمًا۔ (نساء ۸)	تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی، اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں۔

یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا۔ (مائدہ ۴)	اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، جب تم میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰؑ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں ہے، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی۔

اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکًا (بقرہ ۳۲)	بے شبہہ خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا۔

وَاللّٰهُ یُؤْتِیْ مُلْکَهٗ مَنْ یَّشَآءُ۔ (بقرہ ۳۲)	اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً	اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں

فِي الْأَرْضِ (ص ۲) بادشاہ بنایا ہے

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي | اے میرے پروردگار! میری
مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّنْ | مغفرت کر اور مجھ کو ایسی بادشاہی
بَعْدِي | عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایان
(ص ۳) | نہ ہو۔

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی۔ اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ جس کو چاہے دے، اور جس سے چاہے چھین لے

اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي | اے اللہ! اے سلطنت کے مالک
الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ | تو جسے چاہے سلطنت بخشے اور
الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ ۔ (آل عمران ۳) | جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بتا دیا ہے

اِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ | بے شک زمین کے مالک میرے
الصّٰلِحُونَ. اِنَّ فِي هٰذَا | صالح بندے ہوتے ہیں، اس
لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ. | (اعلان) میں خدا کے فرماں بردار
(الانبیاء ۷) | لوگوں کے لئے پیام ہے

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا

معاوضہ ہے، فرمایا۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ۗ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۔

(حج ۶)

اور البتہ خدا اس کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے۔ وہ کہ ہم اگر ان کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں، اور ہر کام کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہوگا، اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجراء کی طاقت ہونی چاہئے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود و تعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ

اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر

فِی دِیْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ	اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی
بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔	ترس نہ آوے، اگر تم اللہ اور پچھلے
(نور۔ ۱)	دن پر یقین رکھتے ہو۔

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کے لئے تیار ہونا چاہیے۔

فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ	تو اے سود کھانے والو! اللہ
وَرَسُوْلِہٖ۔	اور اس کے رسول سے لڑنے
(بقرہ ۳۸)	کے لئے خبردار ہو جاؤ

اس لئے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا[1] جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں، لوٹ مار کریں، قرآن اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہتا ہے، اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطع ید اور قید یا جلاوطنی ہے' اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے۔

ذٰلِکَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ	یہ ان کے لئے رسوائی ہے دنیا میں
فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (مائدہ ۵)	اور آخرت میں ان کے لئے بڑا عذاب ہے

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں

---

[1] ابوداؤد، باب اخذ الجزیہ

بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں تسلی دی:-

اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ. (اعراف ۱۵)

خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو، زمین تو خدا کی ہے (اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ. (اعراف ۱۵)

قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے، اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔

آخر جب وعدۂ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام و بے کس قوم خلافت الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ

اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور

الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا	کم کا وارث بنا دیا، جس میں ہم نے
فِيهَا وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنَى	برکت دی تھی، اور اللہ کی اچھی بات
عَلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا.	بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی
(اعراف ۱۶)	ان کے صبر کی وجہ سے.

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی، لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منھ پھیرنے لگے، تو دفعۃً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشین گوئی فرمائی

وَقَضَيْنَا إِلَى بَنِي إِسْرَائِيلَ	اور ہم نے بنی اسرائیل کو خبردار کر دیا تھا کتاب میں
فِي الْكِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْأَرْضِ	کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے
مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيرًا.	اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے
فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ أُولَاهُمَا	پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر
بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَنَا أُولِي	اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا، تو
بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا	وہ ملک میں گھس گئے، اور اللہ کا
خِلَالَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا	وعدہ ہو کر رہتا ہے، پھر ہم نے
مَفْعُولًا. ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ	ان پر تم کو پھیرا، اور تم کو مال اور
عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ	اولاد سے مدد کی، اور تمہاری تعداد

وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا. إِنْ أَحْسَنتُمْ أَحْسَنتُمْ لِأَنفُسِكُمْ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا. فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوهُ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَلِيُتَبِّرُوا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا.

(بنی اسرائیل ۱)

بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کروگے تو اپنے لئے، اور برا کروگے تو اپنا، پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا، تاکہ تمہارے منہ بگاڑ دیں، اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں، جیسے (تمہارے پہلے دشمن) پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کردیں۔

اہل نظر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کیے گئے ہیں، وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لئے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انھیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی خدا کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی خدا کا وہی برتاؤ ہوگا۔

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انھیں پہلے ہی ہشیار کردیا گیا تھا کہ یہ خلافت وسلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الٰہی کی پیروی کی جائے گی، جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی؛

چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقعے پیش آئے۔ اور دو دفعہ ان کی شامت اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل و محکوم ہونا پڑا۔ ایک بابل کے بادشاہ بخت نصر کے ہاتھوں۔ اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا، ظالم بادشاہوں کے پنجوں میں گرفتار ہونا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے موقع پر ان کو آخری مہلت دی گئی، چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا. اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا.	امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا، اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کرو گے، تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے، اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے، یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے، اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں

(بنی اسرائیل)	بشارت دیتا ہے کہ ان کے لئے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہوگئی، کیونکہ انھیں سنادیا گیا

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ	تم میرا وعدہ پورا کرو، تو میں تمھارا
(بقرہ ۵)	وعدہ پورا کروں گا۔

بقرہ رکوع ۱۰ میں اسی میثاق الٰہی کی بار بار یاد دلائی گئی ہے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد
لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ	لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت
اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	نہ کرنا، اور ماں باپ اور رشتہ داروں
وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ	اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ
حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا	بھلائی کرتے رہنا، اور لوگوں سے
الزَّكٰوةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا	اچھی باتیں کہنا، اور نماز پڑھتے
مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ. وَاِذْ	اور زکوٰۃ دیتے رہنا، تو چند شخصوں
اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ	کے سوا تم سب (اس عہد سے)
دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ	منہ پھیر بیٹھے، اور جب ہم نے
مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ	تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت وخون

تَشْهَدُونَ ثُمَّ أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ
تَقْتُلُونَ أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ
فَرِيقًا مِنْكُمْ مِنْ دِيَارِهِمْ
تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ
أُسَارٰى تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ
عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ. أَفَتُؤْمِنُونَ
بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ
بِبَعْضٍ ۚ

(بقرہ-۱۰)

نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے
نہ نکالنا، تو تم نے اقرار کر لیا، اور تم
(اس بات کے) گواہ ہو، پھر تم وہی ہو
کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو۔ اور
اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور
ظلم سے چڑھائی کر کے انھیں وطن سے
نکال بھی دیتے ہو، اگر وہ تمہارے
پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر
ان کو چھڑا بھی لیتے ہو، حالانکہ ان کا
نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا
(بات) ہے کہ تم کتاب (خدا) کے
بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض سے
انکار کئے دیتے ہو۔

لیکن ان کے اس عہد کو ہمیشہ کے لیے بھلا دینے پر اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو ہمیشہ کے لئے بھلا دیا اور فرمایا

فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذٰلِكَ
مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ

تو جو تم میں سے ایسی حرکت کریں،
ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے

الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیَامَةِ یُرَدُّوْنَ	کہ دنیا کی زندگی میں تو رسوائی ہو
اِلٰی اَشَدِّ الْعَذَابِ۔	اور قیامت کے دن سخت سے سخت
(بقرہ ۱۰)	عذاب میں ڈال دئے جائیں۔

مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل کتاب کو یہ سزا سنادی گئی۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ	اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے
اَنْ یُّذْکَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰی فِیْ	جو خدا کی مسجدوں میں خدا کے نام کا
خَرَابِهَا، اُولٰٓئِكَ مَا کَانَ لَهُمْ	ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی
اَنْ یَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ۵	ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو
لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ	کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں
فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔	مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لیے
	دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں
(بقرہ ۱۴)	بڑا عذاب ہے۔

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہوں اور خدا کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں، ان کے لیے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے، ان کو سولی پر لٹکایا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دئے جائیں، ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے،

ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ	یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے، اور

فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ	آخرت میں ان کے لئے بڑا (بھاری)
(مائدہ ۵)	عذاب (تیار) ہے۔

یہود کے مدعیوں اور عالموں کو جنھوں نے کتابِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنالیا تھا، یہ سزا سنادی گئی۔

لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ	دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت
فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ.	میں بھی بڑا عذاب ہے۔
(مائدہ ۔ ۶)	

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنیاد پر دین میں کج بحثی کرتے ہیں اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں، ان کے لئے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ	اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے
فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی	جو خدا کی شان میں بغیر علم
وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ثَانِیَ	(ودانش) کے اور بغیر ہدایت کے
عِطْفِهٖ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ	اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے
اللّٰهِ ؕ لَهٗ فِی الدُّنْیَا	اور (تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے
خِزْیٌ وَّنُذِیْقُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ	تاکہ (لوگوں کو) خدا کے راستے سے
عَذَابَ الْحَرِیْقِ.	گمراہ کر دے، اس کے لئے دنیا میں

ذلت ہے، اور قیامت کے دن
ہم اسے عذاب (آتش سوزاں)
کا مزہ چکھائیں گے۔ (حج ۱)

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسیٰ علیہ السلام کو وحیِ الٰہی نے خبردار کر دیا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ	(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے
سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ	بچھڑے کو (معبود) بنا لیا تھا،
وَذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا	ان پر پروردگار کا غضب واقع
وَکَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُفْتَرِیْنَ۔	ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت
	(نصیب ہوگی) اور ہم افترا پردازوں
(اعراف ۔۱۹)	کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے ذلت، قومی مسکنت اور غضب الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے، کیونکہ انھوں نے احکام الٰہی سے انحراف کیا، خدا کے رسولوں کو قتل کرتے اور عہد الٰہی کو توڑتے رہے۔

وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَ	اور (آخر کار) ذلت (اور رسوائی)
الْمَسْکَنَۃُ وَبَآءُوْا بِغَضَبٍ	اور محتاجی (و بے نوائی) ان سے
مِّنَ اللّٰہِ۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ	چمٹا دی گئی، اور وہ خدا کے غضب میں

كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللهِ	گرفتار ہو گئے، یہ اس لئے کہ وہ
وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ	خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے
الْحَقِّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّ	اور (اس کے) نبیوں کو ناحق قتل
كَانُوا يَعْتَدُونَ.	کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لئے
	کہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے
(بقرہ - ۷)	بڑھے جاتے تھے۔

آخر الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لئے مہلت کا آخری موقع تھا، لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم رہی، اس پر خدا نے قیامت تک کے لئے ذلت و مسکنت اور غلامی کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا	یہ جہاں نظر آئیں گے، ذلت (کو
ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللهِ	دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے
وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا	بجز اس کے کہ یہ خدا اور
بِغَضَبٍ مِّنَ اللهِ وَضُرِبَتْ	لوگوں کی پناہ میں آجائیں، اور یہ
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذٰلِكَ	لوگ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں
بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ	اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے
بِآيَاتِ اللهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ	یہ اس لئے کہ خدا کی آیتوں سے
بِغَيْرِ حَقٍّ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا	انکار کرتے تھے (اور اس کے)

وَكَانُوا يَعْتَدُونَ ۔	پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے تھے یہ اس لئے کہ یہ نافرمانی کئے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔
(آل عمران ۔ ۱۱)	

دوسری سورہ میں ہے

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۔	اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں، بیشک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔
(اعراف ۔ ۲۱)	

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے، تاریخ کا کون سا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انھوں نے اپنے گناہ کی سزا نہیں پائی ہے، اور آج بھی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

بعض مفسروں نے اس دنیاوی عذاب، ذلت، نکبت اور مسکنت کی تفسیر

"جزیہ" یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی بھی ہے، قرآن پاک کی دعا میں ہے:

اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی	اے اللہ! سلطنت کے مالک!
الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ	تو جس کو چاہے سلطنت دے اور
الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ	جس سے چاہے چھین لے، جس کو
تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ	چاہے عزت دے اور جس کو چاہے
بِیَدِکَ الْخَیْرُ (آل عمران-۳)	ذلت دے۔ تیرے ہاتھ ہی میں بھلائی ہے

ان آیتوں میں لف ونشر مرتب ہے، یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر یہ جو کچھ ہوا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل وقومیت سے نہیں، بلکہ ان کے افعال وکردار سے ہے، احکامِ الٰہی سے انحراف، انبیاء و مصلحینِ امت کا قتل وتکذیب، حرص وطمع، سود خواری اور تمام دیگر ذمائم وقبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کے ذمہ دار ہیں کہ وہ دین کی وراثت اور خدا کی خلافت کے منصب سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیے گئے، پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا،

اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ	(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے
سَیَنَالُھُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ	کو (معبود) بنالیا تھا ان پر پروردگار
وَذِلَّۃٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا	کا غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی

وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ۔ زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم
افتراپردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا
(اعراف ۱۹) کرتے ہیں۔

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچھڑے کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر اس مفتری کے لئے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہ سائی کرے گا اور ارض و سماء کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی کاوش وطلب میں دربدر پھرے گا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا۔

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش
میں) خدا رسوا کرے اس کو عزت
(حج ۲) دینے والا کوئی نہیں۔

عزیزے کہ از در گہش سر بتافت بہ ہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اس کی یہ بندگی اس کے احکام کو بہ دل وجان قبول کرنے اور ان کے مطابق عمل کرنے سے ظاہر ہوتی ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت وبرکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل وجان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شروع میں ایمان، اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے

خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین کا سے برکت کا مینھ برستا اور فتوحات کا

چشمہ ابلتا ہے، خدا نے یہود و نصاریٰ سے خطاب کر کے فرمایا:۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا	اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور
وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ	پرہیزگاری کرتے تو ہم ان سے
وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ۔	ان کے گناہ دور کر دیتے اور ان کو
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ	نعمت کے باغوں میں داخل کرتے
الْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ	اور اگر وہ توراۃ و انجیل کو اور جو
مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ	(اور کتابیں) ان کے پروردگار
فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ	کی طرف سے ان پر نازل ہوئیں،
	ان کو قائم رکھتے تو (اللہ، رزق مینہ
	کی طرح برستا کہ) اپنے اوپر سے اور
(مائدہ ۹)	پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

لیکن افسوس کہ انھوں نے اس آواز پر کان نہیں رکھا تو ان کو وہی سزا دی گئی جو دوسری نافرمان قوموں کو دی گئی تھی،

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا	اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے
وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ	اور پرہیزگار ہو جاتے تو ہم ان پر
مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ	آسمان اور زمین کی برکات کے

كَذَّبُوا فَأَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (اعراف۔ ۱۲)	دروازے) کھول دیتے، مگر انھوں نے تو تکذیب کی، سو ان کے اعمال کی سزا میں ہم نے ان کو پکڑ لیا۔

پھر خاص مسلمانوں سے بطور وعدہ کے فرمایا گیا

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور۔ ۷)	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا

وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَأْخُذُوْنَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ (فتح۔ ۳)	خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کروگے، سو اس نے غنیمت کی تمہارے لئے جلدی فرمائی۔

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لئے ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ	مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے

اَلِیْمٍ. تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ
وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ
خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۙ
یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَیُدْخِلْكُمْ
جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
وَمَسٰكِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ
عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۙ
وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ
اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ وَبَشِّرِ
الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

(الصف - ۲)

وہ یہ کہ خدا اور اس کے رسول پر
ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے
مال اور اپنی جان سے جہاد کرو،
اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے،
وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور
تم کو باغہائے جنت میں جن میں نہریں
بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں
جو بہشتہائے جاودانی میں (تیار)
ہیں، داخل کرے گا، یہ بڑی کامیابی
ہے اور ایک اور چیز جس کو تم بہت
چاہتے ہو (یعنی تمہیں) خدا کی طرف سے
مدد نصیب ہوگی اور فتح قریب ہوگی
اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنا دو

یہ فتح و نصرت اسی دنیا میں ملنے والی تھی، جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی، اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دین الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور غلبہ

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ
بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو
ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا،

عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ	تا کہ اس دین کو دنیا کے تمام دینوں
(توبہ۔۵)	پر غالب کرے۔

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورہ فتح وسورۂ صف میں دہرائی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو بہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے، یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آیندہ پوری ہونا ہے، اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے، لیکن اس کے پورے ہونے کیلئے مسلمانوں پر سعی و کوشش بھی فرض ہے، بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو بصراحت علمبر اسلام کی طرف سے دی جا چکی تھی، تاہم مسلمانوں کو اس کے لیے ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ	اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک
وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ	کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے
(انفال۔۵)	اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے

سارا حکم خدا کے لیے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرماں برداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی وجسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے، جس کی بھی اطاعت ہو وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کہ وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح و نصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے

جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے، دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے۔

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا وَّمَغَانِمَ کَثِیْرَۃً یَّاْخُذُوْنَھَا وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًا ۔ وَعَدَکُمُ اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِیْرَۃً تَاْخُذُوْنَھَا فَعَجَّلَ لَکُمْ ھٰذِہٖ ...... وَاُخْرٰی لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰہُ بِھَا وَکَانَ اللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرًا۔

(فتح۔۳)

(اے پیغمبر!) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا، اور جو صدق و خلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا، تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انھیں جلد فتح عنایت کی، بہت سی غنیمتیں جو انھوں نے حاصل کیں، اور خدا غالب حکمت والا ہے، خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے، تو اس نے غنیمت کی تمہارے لیے جلدی فرمائی ..... اور اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے، اور وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں، اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح و غنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے وہ خیبر کی فتح ہے جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی، اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے، وہ مکہ کی فتح ہے، چنانچہ اس سفر میں حدیبیہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی۔

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا۔	(اے محمد) ہم نے تم کو فتح دی، فتح بھی
(فتح ۱)	صریح اور صاف۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس فتح و نصرت کے وعدہ کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ	جب اللہ کی مدد اور فتح آچکی اور تم نے
وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ	دیکھا کہ لوگ خدا کے دین میں گروہ
فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ فَسَبِّحْ	در گروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ	پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو، اور
(نصر ۱)	اس سے مغفرت چاہو۔

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، طاعات اور عبادات کی

دعوت، فرائض و حقوق کی ادائی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہونچ گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہونچ گیا، اس موقع پر ایک شبہہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا، اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لئے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ شرائع و حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے، تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بآسانی کر سکیں، اس لئے وہ عرضاً مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ط	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دیگا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا وہ میری عبادت کریں گے

اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک

(نور-۷) نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطا، خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو، اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور رد شرک کی دعوت اس لیے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا، اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے اس کی مسجد اس کا دیوان اس کا منبر اس کا تخت تھا، اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی، جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہوگیا تو آپ کو سلطنت کے قیام کی فکر ہوئی، ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے، ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں، لیکن آپ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا،[1] کیونکہ آپ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی بادشاہی نہ تھی، بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا، اسی لیے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی

لہ سیرۃ ابن ہشام ذکر رؤسائے قریش کی گفتگو۔

دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا، اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں، ایک ہی شاہنشاہ علی الاطلاق ہے، جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ، اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے وہی آسمان پر حکمراں ہے اور وہی زمین پر فرماں روا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ	اور وہ وہی ہے جو آسمان میں اللہ
وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (زخرف ۷)	ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے

وہ دنبیوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لئے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین، دونوں میں ایک ہی خدا کی حکومت ہوگی، اس کے آسمان میں نہ کوئی دیبی ہوگی، نہ دیوتا ہوگا، اور نہ اس کی زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ، جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا، اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لئے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ ہے[1]، مسلمانوں کو ہشیار کیا جاتا ہے

وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ	(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے
يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ	جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی
يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ	تلاش میں، اور وہ لوگ ہوں گے جو
(مزمل - ۲)	اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔

[1] بعض روایات میں ہے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایک سال کا فصل ہے، صحیح مسلم باب صلوٰۃ اللیل و بیہقی و حاکم و احمد

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانہ میں سنائی جا رہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ وسنان کی زبان سے بھی سنانے کی نوبت آئے گی، گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو نابود کرنے کی کوشش کریں گے اور بالآخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سربکف میدان میں آنا ہوگا،

جب توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی: سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لئے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ، اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر ہم کوئی کام نہ کریں گے اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں، اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ فصلت کی آیتیں پڑھیں جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آگیا اور واپس آکر قریش سے کہا کہ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام پیش کرتے ہیں، وہ نہ شاعری ہے نہ جادو ہے، اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں، قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا، اس لئے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو، اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آگئے تو ان کی بادشاہی تمہاری ہی بادشاہی، اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی، اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے تمہیں

لنگی جانے کی بھی ضرورت نہ ہوگی. لیکن رئیسوں نے یہ کہکر کہ محمدؐ نے قتبہ پر بھی جادو کر دیا اس راستے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا.

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکٹھے ہوئے اور اس موقع سب نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کی،

"اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو، جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے، تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو، ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو، تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت کے اتحاد میں فرق ڈال دیا، تو اگر اس کلام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ، اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانے لیتے ہیں، اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے"

یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں، مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہیے نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پہ حکومت کرنا میرا مقصد ہے بلکہ تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پہ اتاری ہے، اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ تم کو اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کر دوں. اگر تم اس کو مان لو گے تو دنیا اور دین دونوں میں تمہارا بھلا ہوگا. اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر

کردوں گا، یہاں تک کہ میرے اور تمھارے درمیان خدا کا فیصلہ آجائے۔[1]

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہوگیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہوسکتی تھی، اس کے لئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی، یہ دنیا کی اصلاح، عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین و دنیا کی ہر چیز آجاتی تھی، اور اسی لئے اس کے لئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابوطالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صلح ہوجائے۔ ابوطالب بھتیجے سے کہتے ہیں: جانِ عم یہ قریش کے سردار آئے ہیں، وہ کچھ شرطیں تم سے لینا چاہتے ہیں اور کچھ وہ تم کو دینا چاہتے ہیں۔ ارشاد ہوا: اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہوجائیں گے اور عجم ان کے زیر نگیں ہوگا۔ ابوجہل نے کہا: ہم آپ کی ایک بات نہیں، دس باتیں مانیں گے۔ ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں، اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہوجاؤ۔[2]

حج کے موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جاکر

---

[1] سیرت ابن ہشام۔

توحید کی دعوت دیتے ہیں، اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں: "اے لوگو! کہو خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، تم فلاح پاؤ گے، عرب تمھاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمھارے تابعِ فرمان ہوگا۔ اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے"[۱]

بیعتِ عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسولِ انام علیہ السلام کے دستِ مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے، اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ نے حضورؐ کے دستِ مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا: لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے اس کے لئے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! اب آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں۔ ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اور نماز کھڑی کرو گے، زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لئے جھگڑا نہ کرو گے، اور جس سے تم اپنی اور اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی کرو گے۔ انصار نے ایک آواز سے کہا: ہاں! یا رسول اللہ! آپ کی یہ سب باتیں منظور، لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا: جنت اور فتح و نصرت[۲]

[۱] طبقات ابن سعد جلد اول ص ۱۴۵ و لائیڈن۔ [۲] طبقات ابن سعد جزء ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳۹ لائیڈن

بھی یا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام تمام صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی، اور آخر تلوار کو تلوار سے ٹکرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لیے عرب و عجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا، اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا، یہاں تک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پیدا ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی، مختلف موقعوں پر صحابہؓ کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوشخبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، حملہ آور عربوں کے نرغے میں گھرے ہوئے ہیں، دم بہ دم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آرہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جاں نثار صحابہؓ بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آجاتا ہے، جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں، حضورؐ

تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر ضرب میں چنگاری نکلتی ہے، جس کی روشنی میں پہلے کسریٰ کے شہر، پھر قیصر کے شہر اور تیسری دفعہ حبش کے شہر نظر آتے ہیں، اور حضورؐ ہر دفعہ بلند آواز سے فرماتے ہیں، اللہ کی بات پوری ہوئی۔

اسلام کا آغاز جس بے اطمینانی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا، اس سے کس کو اس وقت خیال ہو سکتا تھا کہ یہ چند نہتے، فاقہ کش، غریب الدیار مسلمانوں کے بازوؤں میں چند ہی سال بعد یہ زور آئے گا کہ وہ قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیں گے، لیکن مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وقت خبر دی تھی کہ مسلمانو! تم قسطنطنیہ فتح کرو گے، مداین تمہارے ہاتھ آئے گا، قیصر و کسریٰ کے خزانے تمہارے تصرف میں آئیں گے، مصر کا تخت تم لوٹو گے، تم سے اور ترکوں سے جن کی آنکھیں چھوٹی اور چہرے چوڑے ہوں گے، جنگیں ہوں گی، ہندوستان تمہاری فوجوں کا میدان جہاد اور بحر روم تمہارے جنگی جہازوں کی جولان گاہ بنے گا، بیت المقدس کی کنجی ایک دن تم کو ملے گی۔[1]

لیکن ان خوشخبریوں، بشارتوں اور پیشین گوئیوں کے ہجوم میں یہ بات بھولنا نہ چاہیے کہ یہ حکومت، یہ بادشاہی، یہ تخت، یہ تاج، یہ خزانے اسلام میں مقصود بالذات نہیں۔ یہ اس لئے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری کے بہت سے موانع کو دور کرنے میں معین ہیں، اور اسلام کے حدود اور قانون عدل و انصاف کے اجراء کے ذریعے ہیں،

[1] ان واقعات کے حوالے سیرۃ النبی جلد سوم پیشین گوئیوں کے بیان میں ہیں۔

اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوں تو وہ اسلام کی حکومت نہیں، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو، دوسری بات یہ ہے کہ اس قوت وطاقت، شان وشوکت اور مال ودولت کو صرف خدا کی مرضی کے حصول میں صرف کیا جائے، اگر یہ نہ ہو تو یہ سلطنت، یہ عیش وعشرت، یہ دولت وحشمت اور جاہ ومال، سوء مآل کا موجب ہو جائے گا، اسی لئے ضروری ہے کہ کروفر سے جی نہ لگایا جائے اور نہ دل میں اس کی لو لگنے پائے اور یہ خیال رکھا جائے کہ یہ دنیا کی سلطنت وحشمت، اور مال ودولت دنیا کی نہیں، بلکہ صرف آخرت کی آرایش کے لئے ہے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ کھیتی دنیا کے لئے ہے، تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی، اور اگر آخرت کے لئے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لئے نور وفلاح کا موجب ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (شوریٰ ۳)	جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو، اس کو ہم اس میں دے دیں گے، اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اسکو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔
وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ	اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے، اور جو آخرت میں طالب ہو اس کو وہاں اجر عطا کریں گے۔

اور ہم شکر گذاروں کو عنقریب بہت

(آل عمران ۱۵) اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو، کیونکہ یہاں کی لذت، عیش و عشرت، آرام و راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ، ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ	اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد
بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا	خدا کے لئے وطن چھوڑا، ہم ان کو
حَسَنَةً وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ.	دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے، اور
(نحل ۶)	آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے۔

جو لوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ	کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی
فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ	پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ
اِلَّا قَلِيْلٌ. (توبہ ۶)	آخرت میں بہت معمولی ہے۔
وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ	اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی
الدُّنْيَا وَزِيْنَتُهَا وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ	زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے
خَيْرٌ وَّاَبْقٰى اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ.	اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور

(قصص ۶) — باقی رہنے والی ہے، کیا تم سمجھتے نہیں

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ — مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو

خَيْرٌ وَّاَبْقٰى. (اعلیٰ ۱) — حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر

وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ — اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کیلئے

يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ. — بہتر ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں۔

(اعراف ۲۱)

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ — پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں

الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ — رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا

اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ. — عذاب تو بہت بڑا ہے، کاش یہ

(زمر ۳) — سمجھ رکھتے۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى — اور آخرت کا عذاب بہت سخت

(طٰہٰ ۷) — اور بہت دیر رہنے والا ہے۔

اگر آخرت کا خیال کئے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھر لے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت و حشمت بے سود۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا — جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی

وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ	زیب وزینت کے طالب ہوں، ہم
فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ۔	ان کے اعمال کا بدلہ انھیں دنیا ہی
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ	میں دے دیتے ہیں اور اس میں
فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ	ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی، یہ وہ
مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا	لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔	آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں،
	اور جو عمل انھوں نے دنیا میں کئے
	سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں
(ہود ۲)	سب غارت۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں پرِکاہ سے بھی کمتر ہے۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا	دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت
فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (توبہ ۶)	کے مقابلہ بہت ہی کم ہیں۔
وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ	اور دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلہ
اِلَّا مَتَاعٌ۔ (رعد ۳)	میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا کی لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ	اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا

الغرور (آل عمران ۱۹، حدید۲) سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لئے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لئے برتنا چاہئے،
جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے:

اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاِنَّکُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَۃِ — دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی ہے، اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لئے ہیں:

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (بقرہ ۳) — وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں، تمہارے لئے پیدا کیں

پھر دوسری جگہ بتایا کہ اور خود انسان کس لئے بنا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ (الذاریات ۳) — اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کو اس لئے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کا ذریعہ بنایا جائے، دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لئے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر

فرمایا ہے:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ	اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا
الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ	ہے اس سے آخرت کو ڈھونڈ اور
مِنَ الدُّنْيَا　(قصص ، ۷)	دنیا سے اپنا حصہ مت بھول

انہی معنوں میں الدنیا مزرعۃ الآخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد عام ہے قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے، ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، فرمایا گیا:

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ	جو لوگ تم میں سے ایمان لائے
عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ	اور نیک کام کرتے رہے ان کا
فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ	خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ	حاکم بنادے گا، جیسا ان سے
دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ	پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا،
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ	اور ان کے دین کو جسے اس نے
أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ	ان کے لئے پسند کیا ہے، مستحکم
بِي شَيْئًا، وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ	و پائدار کردے گا، اور خوف
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ۝ وَ	کے بعد امن بخشے گا، وہ
أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ	میری عبادت کریں گے

وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ.	اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے، اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔
(نور ۷)	

خدا نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کی غرض بتائی ہے، تاکہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پروا ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میرے احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں لگے رہیں، اور اگر اس امن و اطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا۔ نماز کا قیام، زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں

الْاُمُوْرِ ۔ اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے

(حج ۶) اختیار میں ہے ۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الٰہی کی بجاآوری کا سرعنوان ہے قائم کریں، اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں، اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے انسداد کا اہتمام کرسکیں، اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول، نہ خراج کا دھول، نہ غنیمت کی فراوانی، نہ دولت کی ارزانی، نہ تجارت کا فروغ، نہ جاہ و منصب کا فریب، نہ عیش و عشرت کا دھوکا اور نہ شان و شوکت کا تماشا ہے، بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجاآوری اور اس کے لئے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے ۔

عہدِ نبوی میں نظامِ حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں، وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن در حقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی، چنانچہ سنہ ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سر ہنوز اب تک بلند تھا، چنانچہ نامۂ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلہ میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو سنہ ۸ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی و تمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق و مغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کے کسریٰ اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے، اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کی عراقی و شامی حدود پر آکر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب و تمدن کا

نام تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور
وادی ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔
چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت
قائم کی تھی جس کے فرماں روا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت
کرتا تھا یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں، لیکن
آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آگیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا، عرب پر ان دو سلطنتوں کا اس قدر
اقتدار قائم ہوچکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظام تمدن کا
خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور نظام تمدن کا آتا تھا، ان سے
الگ یا ان سے بالاتر کسی نظام زندگی کا تخیل ان کے ذہن کی گرفت سے بالاتر تھا۔
اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے
صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ
بیل ڈالی جائے، بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط،
سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی و تمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے، بلکہ اس سے
بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عرب کو بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی
غلامی سے نکال کر قانون الٰہی کی اطاعت و فرماں برداری میں دے دیا جائے اور

بتایا جائے کہ قانون الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی خواہش کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے، لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض و اعمال میں ترتیب و تدریج ملحوظ رہی ہے اسی طرح اسلام کے نظام حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی، چنانچہ اگرچہ آپ ساری دنیا کی اصلاح کے لئے آئے تھے، مگر آپ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا، تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی اور آپ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے، قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اسی طرح اے مسلمانو! ہم نے
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ	تم کو بیچ کی امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا	بتانے والے بنو اور رسول تمہارا
(بقرہ - ۱۷)	بتانے والا بنے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لئے اور یہ امت مسلمہ دوسری ملتوں اور قوموں کی ہدایت و رہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی ترتیب خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی، چنانچہ سب سے پہلے آپ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ، حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا، اور آپ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح و ہدایت کے نذر ہوگئے، یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لئے آمادہ تھے، اور قبائل یمن کے

ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ کو قبیلۂ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا تھا، لیکن آپ نے ان متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دار الہجرۃ بنایا، وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پُرخطر تھا اور ابتدا میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی، تاہم آپ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن جب مدینہ عرب کے اس حصہ میں کافی طور پر نظامِ اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے دوسرے حصوں کی طرف توجہ کا وقت آ گیا، اس بنا پر اسلام کے دائرۂ عمل کو وسعت دی گئی اور عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت، رؤسائے قوم اور سردارانِ قبائل کے ذریعہ سے ہوئی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حصوں میں بھی یہی طریقۂ دعوت اختیار فرمایا، چنانچہ سب سے پہلے قرب و جوار کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبولِ اسلام پر آمادہ کر دیتا تھا، چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامۂ مبارک آپ نے لکھا تھا، اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدمِ قبولِ اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا، اس سے اگرچہ خود قیصر کا دل نورِ اسلام سے منور ہو چکا تھا، لیکن وہ اتنا کم تھا کہ ملکِ ہرقل اور تختِ زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی، نجاشی بادشاہِ حبش نے آپ کی رسالت کی

تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ کی خدمت میں روانہ کیا، یمن کے تمام رؤسا نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا، عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں اگرچہ پوری طرح پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوۂ تبوک نے آپ کے جانشینوں کے لیے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا، اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظامِ حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا، اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا سب سے آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی کا اعلان تھا، چنانچہ حجۃ الوداع میں آپ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

اَلْيَوْمَ اسْتَدَارَ الزَّمَانُ كَهَيْئَتِهٖ	زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس
يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	وہ اس دن تھا جس دن خدا نے
(حدیث)	آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین، سیاسی تکلفات، بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظامہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا، اس انقلاب نے نہ صرف کسریٰ و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا، بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا، یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

اِذَا هَلَكَ كِسْرٰى فَلَا كِسْرٰى	جب کسریٰ ہلاک ہو گیا تو اس کے
بَعْدَهٗ وَاِذَا هَلَكَ قَيْصَرُ	بعد کوئی کسریٰ نہیں، اور جب قیصر
فَلَا قَيْصَرَ بَعْدَهٗ۔	ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں
(حدیث)	

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون، جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھی، یا اس کو یوں کہیے کہ نظامِ اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگراں و حاکم ہے شوہر اپنے اہل و عیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا، یہی مطلب ہے، اس سے اسلام کے اصولِ سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے،

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کر کے اپنی طاقت و قوت سے سامنے جتھوں کو توڑ کر، ہزاروں گھروں کو ویران کر کے، سب کو زیر کر کے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کر دیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظامِ سلطنت کی جد وجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمحِ نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی بادشاہی، نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص و ہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا،

صرف ایک شہنشاہِ ارض و سما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمانِ الٰہی کے آگے سارے بندگانِ الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیامِ سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجائے خود مقصود بالذات نہ تھی، بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظامہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا، اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرماں روا افراد کی شخصیت، قومیت، زبان، نسل، وطن اور رنگ سے اس کو تعلق نہ ہو، بلکہ اس کی جدوجہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون، طرزِ سلطنت، طریقِ حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے ہو۔

اسی مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب ہوا، ظاہری تو اس لئے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے، اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا، اور اس کے لئے ایسی ہی درمیانی ہمسایہ قوم کی ضرورت تھی، اور معنوی یہ کہ ایسی قوم کے انتخاب کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ وقت کے فاسد نظامِ سلطنت کو مٹانے کے لئے کام میں لائے کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی، عرب کی فطری شجاعت، کوہ شکن عزم و استقلال، زلزلہ انگیز

قوتِ ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومتِ اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں، اور ان اوصاف کی جلا، اخلاص، للٰہیت، صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقِ روحانی ہی سے ممکن تھی، اس لئے اولاً ان کو اس طرزِ حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنے شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال، رعب و اقتدار، اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لئے اختیار کر رکھا تھا، مذکورۂ بالا اخلاقی محاسن کے وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشو و نما کی صورت ایک ہی تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ، مامور من اللہ، ایک پاکباز رہنما، ایک مقدس امیر، ایک معصوم امام کے پرتوِ صحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقویٰ، ایک ایسا پاک احساس، ایک ایسا روشن ضمیر ایک ایسا نورِ ایمان پیدا کیا جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکامِ الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظامِ سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لئے دو شرطیں لازمی ہیں:

(۱) یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

(۲) یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساسِ اولین محض اخلاصِ قلب اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظامِ سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا، اس نظامِ سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے

چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایرانی نژاد، نجد و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر آکر کھڑے ہوگئے اور بادشاہی و شہنشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے، اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہل کار و حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کردیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی، کیونکہ اہل عرب فطرۃً خود دار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرداز کی تھی، مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم کی تھیں، اسلام سے کچھ ہی پہلے کندہ کی جو ریاست رومیوں کے زیر اثر قائم ہوئی تھی، وہ بھی اسی نقشہ پر تھی، قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کئے جاتے تھے، لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سردارانِ قبائل کیلئے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صفیہ، مرباع نشیطہ اور فضول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے، عام مجالس میں لوگوں کو سردارانِ قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا، چنانچہ ایک

جاہلی شاعر جو مذہباً یہودی تھا کہتا ہے:

وننکر ان شئنا علی الناس قولهم ، ولا ینکرون القول حین نقول

اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں ، اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے

سرداران قبائل اپنے لیے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا، چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے:

لاحمى الاحمى الله ورسوله — اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے'

اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا.

سلاطین شاہانہ شان وتجمل سے اونچے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور لعل وجواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے، ان کے امراء علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفرقوں کو مٹا دیا، نشست کے لیے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس وفرش حرام کیے گئے، سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیے ناجائز ٹھہرے، امام وقت اور اس کے حکام کے لیے مسجد اور اس کا صحن ایوان بنا، حاجب ودربان کے پہرے

اٹھ گئے، چاؤش ونقیب رخصت کر دے گئے، طلائی ونقرئی وزمردیں تخت اٹھوا دے گئے، امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملاکر نشست کرتے تھے، اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی، چنانچہ وضع ولباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عام صحابہ میں کسی قسم کا فرق...... موجود نہ تھا، ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبالے کر آئے، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: یارسول اللہ! آپ اسے خرید لیں تاکہ جب دوسرے شہروں یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے، آپ اس کو پہنیں، اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لئے اس ظاہری جاہ وجلال اور تزک واحتشام پر گئی، جس کے شاہانِ وقت عادی تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلمؐ اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیغمبر شاہانہ جاہ وجلال کے اظہار کے لئے مبعوث نہیں ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد کون ہیں؟ لوگ اشارہ سے بتاتے، صحابہؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے جس پر آپ

جلوہ افروز ہوں، مگر اس کو بھی آپ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے، مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیتِ رسول تھے، اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ان کے لئے دوہری سزا ہے، ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں، صحابہ کو یہ گراں گذرا اور انھوں نے آپ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی، آپ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے، پھر فرمایا کہ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا[1]

ایک بار آپ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے، ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ٹوٹ پڑا، آپ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی، آپ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آگیا، آپ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو، لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے معاف کر دیا[2]

---

[1] یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ہے، مثلاً کراہۃ الشفاعۃ فی الحدود اذا رفع الی السلطان۔

[2] ابوداؤد ج ۲، ص ۱۵۸، کتاب الحدود۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمایئے، لیکن آپ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔[1] ابطالِ سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا، جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا معاف فرمایا۔ اسلامی محاصل زکوٰۃ وصدقہ وعشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندانِ نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں۔ بخلاف اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کاملہ ہی آپ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ وہی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ نے ان سب کو مٹا دیا، فرمایا، خدا کے نزدیک سب سے برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے آپ کو شاہ شاہان کہے، ایک دفعہ آپ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: یہ تو اللہ کے لئے ہے، آپ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر

---

[1] ابو داؤد۔

فضیلت دیں۔

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ کے صاحبزادہ ابراہیمؑ کا انتقال ہوچکا تھا، اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لئے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیم کی موت کی طرف منسوب کردیا، لیکن جب آپ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا۔[1]

ایک بار ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا، آپؐ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار آپؐ کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا کہ خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمدؐ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپؐ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہوگیا کہ حق کس کا حق تھا،[2] حالانکہ یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جاسکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین مقصود ہوتی ہے۔

ایک بار آپ نماز پڑھا رہے تھے، حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: "خداوندا! مجھ پر اور محمدؐ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے علاوہ کسی پر رحم نہ کر" آپ نے سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ تم نے وسیع چیز کو تنگ کردیا۔

---

[1] بخاری باب الکسوف [2] مسند ج ۳، ص ۴۳۵ مسند اسود بن السریع

بدوکو ٹوکا کہ "تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمتِ الٰہی کو محدود کر دیا"[1] حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا جس پر سلاطینِ زمانہ اکرام وانعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی ملک سمجھا اور اپنے ذاتی وخاندانی عیش وآرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا، اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے لیکن جو نظامِ سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے، اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لئے تھے، زکوٰۃ، صدقہ، خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا، لیکن آپ نے اس کو اپنا نہیں، بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے۔ زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرما دی اور اس کو بحکمِ الٰہی عام غرباء اور اہل حاجت کا حق قرار دیا، اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا، ابوداؤد میں ہے

قال ما اوتیکم من شیءٍ و	"میں تم کو نہ کچھ دے سکتا نہ کچھ روک سکتا ہوں،
ما امنعکم ان انا الا خازن	میں صرف خزانچی ہوں، جس موقع پر

[1] بخاری ج ۲ ص ۸۸۹ کتاب الادب

اضع حیث ما امرت[1] صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے وہاں صرف کرتا ہوں۔

دوسرے موقع پر فرمایا:

انما انا قاسم واللہ یعطی میں تو صرف بانٹنے والا ہوں، دینے والا تو خدا ہے۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدین ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضورؐ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا، اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضورؐ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار اور محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا، اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضورؐ کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضورؐ اس کی آمدنی اپنی صوابدید سے اپنی خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کی ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرما دیا تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کی ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لئے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے، چنانچہ انھیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرتؐ

[1] ابوداؤد ج ۲، ص ۱۷، کتاب الخراج والامارۃ۔

سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش الہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ کے اُس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں، دیکھا تو آپ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی ٹیک لگائے ہوئے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں، حجرہ میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا، ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے، اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا، عرض کی: اے اللہ کے نبیؐ! میں کیوں نہ روؤں جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے، اُدھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں، اور حضور اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ! دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی: یا رسول اللہؐ! دعا فرمائیے کہ خدا آپ کی امت کو فارغ البال کرے، کیونکہ رومی اور ایرانی باوجودیکہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دے رکھے ہیں، آپ دفعۃً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: "کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو، رومی اور ایرانی تو

دی جا رہی ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیے گئے ہیں۔[1]

اس تقریر دلپذیر کی تاثیر دیکھیے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تزک واحتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے، جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع بھی پہن کر اور جو چٹرے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

قیس بن سعدؓ ایک صحابی تھے، وہ حیرہ گئے وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں، ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انھوں نے دل میں کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں[2]، دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گذرو گے تو سجدہ کرو گے؟ عرض کی نہیں! تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہیے[3]،

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضورؐ کو سجدہ کیا، آپ نے حیرت سے فرمایا: معاذ! یہ کیا؟ عرض کی: یارسول اللہ!

---

[1] بخاری و مسلم، کتاب النکاح، باب الایلاء [2] یعنی بیوند دار کپڑا (مصاحب)، [3] ابوداؤد، کتاب النکاح۔

میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں، تو دل چاہا کہ میں بھی حضور کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ خدا کے سوا کسی اور کو اگر میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔[۱]

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب وجوار کے سلاطین کی طرح عیش وآرام اور تزک واحتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھا دیا کہ یہ استکبار وترفع اور اسراف وتبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی زیب وزینت سراب کی نمائش اور حباب کی سربلندی سے زیادہ نہیں، اللہ تعالی نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ کے بعد آپ کے خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی کی پیروی کی، اور یہی سادگی وتواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا وبخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امراء کے حقوقی استحقاق اور سعی وسفارش کی بنا پر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولتمندوں کی دولتمندی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام الہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولتمندی اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور

---

[۱] ابن ماجہ، کتاب النکاح۔

ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفا کا حق اقویا کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ نگینے بھرے تھے، آپ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا[1]۔

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات وتصنعات اور غلامی وعبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آتا تھا، اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہ نبوت میں ایک طائر بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمد کہہ کر خطاب کرتا اور حضورؐ خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے، اور مسلمان یارسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا، آپ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا۔ مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضورؐ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے، تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا، اور حضورؐ اس کو شفقت سے سنتے تھے، اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

---

[1] دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الخراج میں ہیں۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو قائم رکھے یا توڑ دے، حضرت بریرہؓ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ایک لونڈی تھیں، وہ جب آزاد ہوئیں تو انھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی، ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے، آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا، انھوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں! سفارش ہے، عرض کی تو قبول سے معذور ہوں[1]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا، فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ نے اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے یا اپنی رائے ہے؟ فرمایا: رائے ہے، انھوں نے عرض کی: یا رسول اللہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے، بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہئے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا، اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ

انتم اعلم بامور دنیاکم	تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو

[1] صحیح بخاری، باب تکون الحرۃ تحت العبد و باب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرۃؓ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق یہی حکم ہے، اور اگر آزاد ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لئے کرتے ہوں گے، اس لئے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا، چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر گذر ہوا تو دریافت فرمایا، انھوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی، تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو ان تمام امور میں جن کا تعلق وحی سے ہے، میری اتباع ضروری ہے، لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہی ہوں، تم آزاد ہو۔[1]

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربات سے ہے، یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے، لیکن جن امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو علم بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت خداوندی پر مبنی ہوتا، جس کی اطلاع حضور کو بذریعۂ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے، اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوۂ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے، اس لئے وہ جوش اسلام میں بے تاب ہو گئے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ

[1] صحیح مسلم، باب الفضائل

کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: بے شبہہ ہوں، انھوں نے کہا، کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بے شبہہ ہیں، انھوں نے کہا: تو پھر ہم دین کے بارہ میں اس قدر کیوں دبتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد کرے گا، انھوں نے کہا کہ کیا آپ نے ہم سے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! لیکن کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اس سال کریں گے؟ انھوں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: تو پھر آؤ گے اور طواف کرو گے، لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی، انھوں نے بھی وہی جواب دیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیے تھے، آخر میں جب اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آگئی تو انھوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا، روزے رکھے اور غلام آزاد کیا۔[1] اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض معروض کی، مگر حضورؐ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا، کیونکہ یہ فیصلہ ارادتِ ربانی سے کیا گیا تھا۔

اسی طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائطِ صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا، تو چونکہ ان کے شدتِ شوق زیارتِ کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لئے ان کو حزن و ملال ہوا، اور اس کے سبب سے مسلمانوں نے تعمیلِ ارشاد میں تساہل برتا، جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ شاید

[1] بخاری ج ۱ ص ۳۸۰، کتاب الشروط۔

یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے، لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ اپنی رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحت ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گزرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے، ام المومنین رضؓ نے چہرۂ مبارک پر آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا، آپ نے واقعہ بیان فرمایا، حضرت ام سلمہ رضؓ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں، آپ خود اپنا احرام کھول دیں، چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا، شمع نبوت کے پروانوں (صحابہ رضؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضورؐ اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے، پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے،

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں، حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امر الٰہی سے تھا، اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امور تجربیہ سے تھا، اس لئے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔[۱]

---

[۱] اس قسم کے واقعات پر کوئی یہ شبہہ نہ کرے کہ خدانخواستہ علم النفس کا یہ نکتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر حضرت ام سلمہؓ کو معلوم تھا، بات یہ ہے کہ شاگردوں کے علوم درحقیقت استادوں ہی کے فیض سے ہوتے ہیں، جن سے کبھی ان (استادوں) کو اس لئے ذہول ہو جاتا ہے کہ وہ ان علوم و مسائل سے بھی زیادہ اہم مسائل میں مصروف ہوتے ہیں، اس لئے ادھر ان کی پوری توجہ نہ ہونے سے شاگرد نے اس صورت کو پیش کر دیا جو اس کو خود اسی استاد کی تعلیم ہی سے حاصل ہوئی تھی۔

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضورؐ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضورؐ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آب پاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا، قانونِ اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنویں سے قریب تر ہو اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے، لیکن آپؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آب پاشی کر لو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیرؓ آپ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپؐ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آب پاشی کر کے پانی روک لو، یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہونچ جائے[1] یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسروں کے کھیتوں میں از خود چلا جائے، یوں نہ جائے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الفقہ، جلد ۲، ص ۶۱۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مال غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ انصاف فرمایئے! آپؐ نے فرمایا اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا، اگر آپ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں لیکن آپؐ نے ان کو روک دیا، اور فرمایا کہ اس کے کچھ ہمراہی ایسے ہوں گے جن کی عبادتوں کے سامنے تم کو اپنی عبادتیں حقیر معلوم ہوں گی، یہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کے گلے کے نیچے نہیں اترے گا، یہ مسلمانوں کے تفرقہ کے زمانہ میں اپنی جماعت الگ بنائیں گے، (یہ پیشین گوئی امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خوارج کے ظہور سے پوری ہوئی)

یہ دونوں اعتراض اگرچہ عرض واجب کی حد سے گذر کر گستاخی کی حد تک پہونچ گئے تھے اور عجب نہیں کہ ان میں سے بعض نکتہ چینی منافق ہوں، تاہم اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی اپنی جہالت اور غلط فہمی سے بُرے اسلوب سے بھی آپ پر اعتراض کرتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کرم و شفقت سے اس کا تحمل فرماتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل میں آپ کے بعد آنے والے خلفاء اور امرائے اسلام کے لئے حق شناسی، حق کوشی، حق گوئی اور حق کی پیروی میں ذاتی جاہ و اعزاز اور فخر و غرور کو دخل نہ دینے کی کتنی بڑی تعلیم تھی۔

عمال و حکام درحقیقت خلیفہ یا بادشاہ کے قائم مقام ہوتے ہیں، اس لئے اُن پر

لہ بخاری جلد اول، ص ۵۰۹ باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

نکتہ چینی کرنا گویا خود خلیفہ پر یا بادشاہ پر نکتہ چینی کرنا ہے، عہد نبوت میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں نے عمال نبوی کی شکایت کی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ قانون کی کسی دفعہ سے ان کو خاموش کر دیا ہو، یا حکام کی حمایت میں معترضین پر کسی قانونی جرم کو عائد فرمایا ہو، اخلاقی طور سے دونوں کو سمجھا دیا، حکام وعمال سے فرمایا "ہاں! مظلوم کی بد دعاء سے بچتے رہنا کہ ان کی دعاء اور قبول میں کوئی چیز حارج نہیں ہوتی، اور معترضین سے فرمایا کہ تم اپنے عاملوں کو اپنے عمل سے راضی رکھو[۱]"

لیکن ان سب سے زیادہ سخت وہ مواقع ہیں جہاں بعض لوگوں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے درشتی اور سختی کے ساتھ مطالبہ کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے معترضین کے ساتھ بھی لطف وکرم فرمایا، اور عدل وانصاف سے بھی زیادہ ان کو عطا فرمایا۔

ایک بار ایک اعرابی نے آکر آپ کی چادر پکڑ لی اور اس زور سے کھینچی کہ آپ کی گردن سرخ ہوگئی، آپ اس کی طرف پھرے تو اس نے کہا میرے ان دونوں اونٹوں کو لاد دو کیونکہ جو لادو گے وہ نہ تمہارا مال ہوگا اور نہ تمہارے باپ کا، حضور نے تین بار فرمایا: نہیں! استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، نہیں استغفر اللہ، اس کے بعد فرمایا: میں اس وقت تک نہیں لادوں گا جب تک تم نے جو اس زور سے مجھے کھینچا ہے اس کا بدلہ نہ دو، مگر وہ اس سے انکار کرتا رہا، پھر آپ نے معاف فرما کر حکم دیا کہ اس کے ایک اونٹ پر جو اور دوسرے پر

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۲، ص ۳۶۶، کتاب الزکوٰۃ، باب ارضاء السعاۃ

کھجوریں لا دی جائیں[1]

ایک دن ایک بدو آیا، جس کا کچھ قرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا، بدو عموماً سخت مزاج ہوتے ہیں، اس نے نہایت سختی سے گفتگو شروع کی، صحابہؓ نے اس گستاخی پر اس کو ڈانٹا اور کہا: تجھ کو خبر ہے کہ تو کس سے ہمکلام ہے؟ بولا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں کو اسی کا ساتھ دینا چاہیے کیونکہ اس کا حق ہے، اس کے بعد قرض ادا کرنے کا حکم فرمایا اور اس کو اس کے حق سے زیادہ دلوا دیا۔[2]

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں، آپؐ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکا لیا، گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے، باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا، لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں، اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی! لوگوں نے جھڑکا کہ رسول اللہ بدمعاملگی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں، اس کو چھوڑ دو، اس کو کہنے کا حق ہے، پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا، اس نے پھر وہی لفظ کہے، لوگوں نے پھر روکا، آپؐ نے پھر فرمایا: اس کو کہنے دو، اس کو کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار دہراتے رہے، اس کے بعد آپؐ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوا دیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے، جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب الحلم [2] ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان۔

تو آپ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، اس کا دل آپ کے حلم و عفو اور حسن معاملہ سے متاثر تھا، دیکھنے کے ساتھ بولا: "محمد! تم کو خدا جزائے خیر دے، تم نے قیمت پوری دی، اور اچھی دی[1]۔"

بہرحال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے، ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا ناروا بیہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے، جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے، لین دین کا کاروبار کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا، میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی، اور سخت و سست کہہ کر کہا کہ "اے عبدالمطلب کے خاندان والو! تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو۔" حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہوگئے، اس کی طرف منہ کر کے کہا: او خدا کے دشمن! تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا: عمر! مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی، اس کو سمجھانا چاہیے تھا کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے، اور مجھ سے کہنا چاہیے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کر دوں، یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ! اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دیدو، یہودی حلم و عفو کے اس پر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہوگیا[2]۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۶، ص ۲۶۸۔ [2] یہ روایت بیہقیؒ، ابن حبان، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے، اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے۔ (شرح شفا، از شہاب خفاجی)

ایک دفعہ آپ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا تھا، اور وہ بھی موٹا اور گندہ تھا، پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا، اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا، اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا، مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ناگوار جملہ سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں[1]۔

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے، لوگوں نے اس حیثیت سے آپ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا آپ نے اس کو کس تحمل اور عفو سے سنا، اور معاملہ کا فیصلہ کیا، یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کردی، ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امراء کے غرور و تجبر سے ملائیے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے ہیں، اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار و گیر سے برتر ہے، اس سے بھلا برا جو کچھ ہو، وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے، لیکن اسلام کے قانون کی نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم اور راعی و رعیت

[1] جامع ترمذی، کتاب البیوع۔

قانون کی دار و گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا، اور آپ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے داخل جہنم کر سکتی تھی، بااین ہمہ آپ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لئے تھا کہ آپ کا یہ اسوہ آیندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لئے عملی سبق ہو، اور اس کے لئے نہایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے، تاکہ آیندہ آنے والے امراء اور حکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے کبھی ذات شاہانہ پر اس رو در رو سوال و جواب، استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، یونان اور روم میں کسی زمانہ میں سنتے ہیں کہ جمہوری سلطنتیں قائم تھیں، لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراء کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا، اور نہ ان کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع، اس خاکساری، اس عفو و حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا، اور نہ آسکتا تھا، وہ اخلاص قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا، اور وہ اس کے پجاری تھے، اور وہ

اس عہد و نا کے لیے سب کچھ کر سکتے تھے، اور ان کا وطن چہار دیواری میں محدود تھا جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی، اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے، بلکہ اس ذات اقدس سے ہے، جس کی خاکِ عقیدت مسلمانوں کی چشم ادب کا سرمہ تھی، اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی، بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی، صلوات اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت و امارت اور حکومت کے کاروبار میں اہلِ رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کرکے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ مشورہ کرتے تھے ایک تو اس لیے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے، اور دوسرے اس لیے کہ چونکہ آپ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا تھا، اس لیے آپ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفاء و امراء کے لیے مثال و نظیر کا کام دے، آپ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران۔ ع ۱۷)

(اے رسول! امور سلطنت و جنگ وصلح میں) اپنے رفیقوں سے مشورہ لیا کیجئے

چنانچہ حضورؐ نے اس پر بہ نفسِ نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی، انھوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ،	ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی
(شوریٰ ع ۴)	مشورہ سے انجام پاتے ہیں۔

اگرچہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزا وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی، تاہم احادیث کے تتبع و استقرار سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا، اور ان کی رایوں پر عمل کیا، اور اس کا منشا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تاکہ مفید نتیجہ تک پہونچنے میں آسانی ہو، نہایت مناسب ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔

مدینہ پہونچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے، اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی، اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا، یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا، بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا، بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی، لیکن آپؐ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا، آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی

کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپ نے انکی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، انھوں نے "الصلوٰۃ جامعۃ" کہہ کر پکارا، اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رویا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی[1] بعد فیض تاثیر سے بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا[2] اور آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا، چنانچہ آپ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان دینے کا حکم دیا،

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کر یا میدانِ جنگ کے قریب پہونچ کر آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے تمام صحابہ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی، یہاں تک کہ ایک انصاری رئیس نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ[3]! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہدیں کہ تم اور تمہارا رب جاکر میدانِ جنگ میں دشمنوں سے لڑے، ہم تو یہیں رہیں گے، خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے،

اس کے بعد جب آپ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جاکر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک تجربہ کار صحابی نے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ حسب فرمانِ الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ

---

[1] مصنف عبد الرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب المراسیل لابی داؤد و فتح الباری ابن حجر و روض الانف سہیلی وزرقانی علی المواہب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان، نووی میں ہے: فشرعہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعد ذلک اما بوحی او باجتہادہ صلی اللہ علیہ وسلم علی مذہب الجمہور فی جواز الاجتہاد لہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیس ھو عملاً بمجرد المنام ھذا مما لا یشک فیہ بلا خلاف۔

[2] ابوداؤد و ترمذی، باب بدء الاذان۔

ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے۔ اس پر انھوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہئے تاکہ پانی اپنے قبضہ میں رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور وہیں جاکر قیام فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپ نے پھر تمام صحابہ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ لوگوں نے مختلف رائیں دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔[1]

احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں۔ اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافقِ مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، پھر پُرجوش جاں نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر سے باہر نکل ہم کو لڑنا چاہیے۔ اور حضور کا صحابہ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا سامنا کرنا ہمارے حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوۂ حنین میں جب قبیلۂ ہوازن کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپ کے پاس آیا ہے واپس کر دیا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے، ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا۔ ان لوگوں نے

---

[1] ترمذی ص ۵۰۳۔ کتاب التفسیر سورۂ انفال۔

قیدیوں کو انتخاب کیا، اور آپ نے ان کی درخواست قبول کر لی۔ اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی آپ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں، اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں، اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے۔ جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو، وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں۔ جس وقت پہلا مالِ غنیمت آئے گا، ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا۔ تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ "یا رسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں"۔ آپ نے ان کے اس عاجلانہ اظہارِ رائے کو کافی نہیں سمجھا۔ فرمایا کہ ہر ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے اور کون راضی نہیں ہے؟ اس لیے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام وعریف ہمارے پاس بھیجنا چاہیئے، چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔[1]

احادیث کی کتابوں کا استقصار کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

---

[1] ابو داؤد، کتاب الجہاد و صحیح بخاری، کتاب المغازی۔

قیامِ سلطنت اور آئینِ سلطنت کے باب میں اسلام کا ایک فیض یہ بھی ہے کہ اس نے سلطنت کو بھی مذہب اور عبادت بنا دیا، اس شعبۂ حیات کو جس میں تمام تر درندگی، بہیمیت، مکر و فریب، دغل و سازش، ظلم و ستم اور جبر و تعدی شامل تھی، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ سیاست کی راہ میں ہر گناہ ثواب ہے، اسلام کی تعلیم نے اتنا پاک و بلند کیا کہ وہ عرش کا سایہ بن گیا، احادیث میں متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ

السُّلطان ظلّ اللّٰہ فی الارض	یعنی صاحبِ حکومت زمین میں اللہ کے
یاوی الیہ کل مظلوم من	اس کا سایہ ہے۔ جس کے دامن میں
عباد اللّٰہ[1] (حدیث)	بندگانِ الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ پاتا ہے

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ

السُّلطان العادل المتواضع	عادل اور متواضع حاکم زمین میں خدا کا
ظلّ اللّٰہ و رمحہ فی الارض	سایہ اور اس کا نیزہ ہے۔

(حدیث)

خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "عادل امام کو قیامت کے دن خدا کا سایہ نصیب ہوگا۔"

---

[1] و لہ یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوہریرہؓ بخاری میں اور بروایت ابن عمرؓ بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیقؓ ابن ابی شیبہ میں ہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوعاً نہیں بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں، تفصیل کے لئے دیکھئے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفاء و مزیل الالتباس عجلونی لفظ سلطان۔ یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قدیم عربی میں السلطان کے معنی

جو لوگ سلطنت کے کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دیں ان کو اپنے اس حسن عمل کا ثواب اسی طرح ملے گا جس طرح دوسری عبادات کا، گویا حکومت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ سلطنت بھی عبادت ہوگئی اور ہر قسم کی بددیانتی، خیانت، فریب، سازش، تعدی و ظلم کا اسلامی سیاست سے خاتمہ ہوگیا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے زمانہ میں رومیوں سے ایک مدت معینہ کے لیے صلح کرلی تھی، لیکن وہ اس مدت کے اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں، ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے جس کو

(بقیہ ص ۱۰۰) بادشاہ کے نہیں بلکہ طاقت و قوت کے ہیں جو انگریزی لفظ 'پاور' کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مرادف ہے۔ اس لیے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عادلانہ نظام حکومت مخلوقات الٰہی کے آرام و آسائش کے لیے گویا زمین میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عمال حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں، سلطان کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے حدیث میں ہے، اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَهٗ یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے۔ یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے اس لیے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی، حاکم اور والی سلطان کہلائے گا۔ بادشاہ کے معنی میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔

مسلمانوں کو باز رہنا چاہیے، یہ سن کر انھوں نے اپنی فوج ہٹالی[1]۔

ہر سلطنت کو ٹیکس، مال گزاری، اور خراج کے وصول کرنے کے لئے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا ہے، اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعۃً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے، مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائیگا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی، اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ہر قسم کے خدع و فریب، مکر و حیلہ اور دروغ بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا، اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یورپ آج ظاہری و نمایشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے، تمام ملک میں تعلیم عام ہو گئی ہے، ہر فرد رموز سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو گیا ہے، لیکن بااین ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہوگا، مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں، کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لئے ہزاروں، لاکھوں خرچ کر دیتے ہیں، باوجودیکہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لئے دی جاتی ہے، لیکن بااین ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا، بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت

---

[1] صحیح بخاری، باب فضل من ترک الفواحش۔

دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے، ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے، اس لئے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے، اسلام کا نظامِ سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لئے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے اس کا ادا کرنا ان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی، ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی، صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لئے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں عمال مقرر کر دئے گئے تھے تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و سررشتہ اور نظام قائم نہیں ہوا تھا، ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ و زکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں لیکن یہ اسلام کے نظامِ سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفیٰ سے روایت ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں

اذا اتاہ قوم بصدقتھم قال اللھم صل علی آل فلان، فاتاہ ابی بصدقتہ فقال اللھم صل علی آل ابی اوفی.	جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوندا فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما، چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے، تو آپ نے فرمایا کہ خداوندا! ابو اوفی کی آل پر رحمت بھیج!
(بخاری، کتاب الزکوٰۃ ص ۲۰۲)	

حدیث

حضرت عدیؓ ابن حاتم قبیلہ طے کے سردار تھے، اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھا ملتا تھا، جو عرب میں اسلام سے پہلے سرداران قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا، لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا، صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ان کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا:

ان اول صدقۃ بیضت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ووجوہ اصحابہ صدقۃ طیٔ جئت بھا[1]	پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا، قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے.
(مسلم ج ۲ کتاب الفضائل) (حدیث)	

قبیلۂ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا:

صدقات قومنا[2] (حدیث)	یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے.

[1] مسلم ج ۲. کتاب الفضائل. [2] ایضاً

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تھی، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جاکر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لاکر صدقہ میں دیتے تھے۔[1]

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے، لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے اُن کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نور ایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لئے بیتاب ہو جاتے تھے، چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہ نبوت میں آکر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے، اسلام میں جرائم کی سزائیں نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں، زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں یا سنگسار کیا جاتا ہے، تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعتراف جرم کا جذبہ پیدا کرتی تھی اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے، اپنے جرموں کا از خود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کی درخواست کرتے تھے۔

ماعز ابن مالکؓ ایک صاحب تھے، انھوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا، جب انھیں ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر از خود اس جرم کا اظہار کیا، اور عرض کی، یا رسول اللہ! مجھے پاک کیجئے (صحیح مسلم باب الرجم) یا رسول اللہ مجھ پر حد جاری

---

[1] صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوٰۃ باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ و کتاب الاجارۃ باب من آجر نفسہ

فرمائی جائے، آپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انھوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمایئے، اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے رہے، اور آپ اعراض فرماتے رہے، چوتھی بار آپ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہمبستر ہوئے؟ انھوں نے کہا، ہاں! آپ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انھوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انھوں نے کہا ہاں! ان تمام مراتب کے بعد آپ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا، جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انھوں نے بھاگنا شروع کیا، بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر مارا اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا، شاید وہ توبہ کرتے اور خدا ان کی توبہ کو قبول کر لیتا۔[1]

اس واقعہ سے قانون سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا، کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا، لیکن انھوں نے از خود اپنے تیمار داروں سے اس کا اقرار کیا اور ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر میری طرف سے عرض کرو اور فتوی

[1] ابوداؤد ج ۲، ص ۵۴۸ و صحیح بخاری، کتاب الحدود۔

پوچھو، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا گیا، حضورؐ نے ان کی شدت علالت کے سبب سے ایک معمولی سزا تجویز کی[1]۔

کعب بن عمرو ایک اور صاحب کا واقعہ ہے، جنھوں نے آکر یہ اقرار کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے ایک بیگانہ عورت سے اوپر سے لطف اندوزی کی ہے، گو ہمبستر نہیں ہوا، تو یہ گنہگار موجود ہے اس پر اللہ کا حکم جاری فرمائیے[2]۔

غزوہ حنین کے بعد ان اطراف میں اسلام کے اقتدار کا آغاز تھا کہ ایک حبشی نے جس کا نام محلم تھا، قبیلۂ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر دیا، دونوں کے حامی اور طرفدار رئیس خدمت اقدس میں آئے اور فیصلہ چاہا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق خون کا معاوضہ ادا کر دینا چاہا، مگر ایک فریق کی طرف سے قصاص پر اصرار اور دوسرے کی طرف سے انکار اس جوش سے ہوا کہ دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں، ایک نے اٹھ کر کہا کہ یا رسول اللہ! ابھی اسلام کے اقتدار کا آغاز ہے، ابھی ایسی نرمی نہ کی جائے کہ بھیڑ پہلے ہی بدک جائے، لیکن حضورؐ نے دیت ہی پر زور دیا، یہ دیکھ کر قاتل نے آگے بڑھ کر خود اپنے کو پیش کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے یہ گناہ ہوا ہے، میری مغفرت کے لئے دعا فرمائیے[3]۔

یہ واقعات ایک دنیوی سلطنت اور ایک اخلاقی سلطنت میں نمایاں حد فاصل قائم کر دیتے ہیں، دنیوی سلطنت میں مجرم اس لئے جرم سے انکار کرتے ہیں کہ ان کو سزا

---

[1] ابو داؤد، باب فی اقامۃ الحد علی المریض [2] ایضاً باب فی الرجل یصیب من المرأۃ دون الجماع و صحیح بخاری حدود [3] ابو داؤد، کتاب الدیات۔

نجات مل جائے گی، لیکن ماعز رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی نے اس بنا پر جرم کا اقرار کیا کہ دنیاوی سزا کے اجراء سے وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائیں گے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا و استغفار سے ان کے گناہ معاف ہو جائیں گے، دنیوی سلطنت میں جلاد اس بنا پر سزا دیتا ہے کہ وہ اس خدمت پر مامور ہے، لیکن صحابہؓ نے ماعز پر اس لیے پتھر برسائے کہ انھوں نے حکم الٰہی کی بے محابا تنفیذ کی توفیق پائی، دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے، لیکن اسلام کے نظامِ سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرزِ عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہونچانے کے لیے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے، بڑے بڑے جرائم سے درگذر کر سکتی ہے، رعایا کے ساتھ نہایت نرمی و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہِ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی، عہدِ نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہونچ سکتا تھا، مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انھوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایک عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی، حاطب رضی ابن بلتعہ ایک صحابی تھے، انھوں نے کفارِ قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے

مخفی حالات کی خبر دی تھی، یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا کہ خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے، خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل و اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں، ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے، لیکن میرے بال بچوں کا وہاں کوئی سہارا نہیں تھا، اس لئے میں نے چاہا کہ کفار پر ایک احسان کر دوں جس کے بدلے میں میرے بال بچوں کی حفاظت ہو جائے، آپ نے فرمایا: سچ کہتے ہیں، ان کی نسبت صرف اچھے کلمات استعمال کرو، بدگمانی کو راہ نہ دو لیکن حضرت عمرؓ نے پھر کہا کہ اس نے خدا، خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے، اجازت دیجئے کہ اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ نے فرمایا، کیا وہ اہلِ بدر سے نہیں ہیں، کوئی بات تو ہے جس کی بناء پر خدا نے اہل بدر کے متعلق یہ فرمایا ہے

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ (سورہ حم سجدہ ۵) جو چاہو کرو

یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور کہا کہ خدا اور رسول کو سب سے زیادہ علم ہے [1]

---

[1] بخاری ج ۲، کتاب المغازی، ص ۵۶۰۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن بلتعہ کے معاملہ میں جو طرز عمل اختیار فرمایا وہ شرکت بدر کی فضیلت پر مبنی تو تھا ہی، اس کے ساتھ ایک ایسے اصول پر بھی مبنی تھا جس کو دنیوی اور اخلاقی سلطنتوں کے درمیان ایک حد فاصل قرار دیا جاسکتا ہے، سیاست کا ایک لازمی جزو بدگمانی ہے، اور اسی بنا پر وہ بادشاہ سب سے زیادہ مدبر اور دوراندیش خیال کیا جاتا ہے جو سلطنت کے راز کو اپنے عزیز و اقارب تک سے چھپائے لیکن یہ اصول صرف دنیوی سلطنتوں کا ہے، اور اسی وجہ سے ان سلطنتوں میں حاکم و محکوم میں اتحاد اور خلوص نہیں پیدا ہوتا، لیکن اخلاقی اور مذہبی سلطنتوں میں تمام تر دارومدار اخلاص باہم، باہمی خلوص اور اعتماد پر ہے اور اسی خلوص و اعتماد کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب بن بلتعہ کے جرم سے چشم پوشی کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان مختصر الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

حسن الظن من حسن العبادۃ   حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

(ابوداؤد کتاب الادب ۱۹۸ حدیث)

قرآن مجید نے اس کو اور واضح کردیا ہے:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (سورہ حجرات)   بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی ہے:

ان الامیر اذا ابتغی الریبۃ فی الناس افسدھم۔   جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو بگاڑ دیگا۔

(حدیث)

اور عمالِ سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویۃ قال سمعت	حضرت معاویہؓ سے روایت ہے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
یقول انک ان اتبعت عورات	اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے
الناس افسدتھم او کدت	تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا یا عنقریب
ان تفسدھم۔ (حدیث)	برباد کروگے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا، تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا، حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، لیکن چونکہ انھوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لئے فرمایا کہ ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔

دخین حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کے منشی تھے، انھوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں، میں نے ان کو منع کیا، وہ لوگ باز نہیں آئے، اب ان کے لئے پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ "درگذر کرو" دخین نے دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترک شراب سے انکار کرتے ہیں، میں پولیس کو بلاتا ہوں، حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ درگذر کرو، کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ

من رای عورۃ فسترھا کان کمن احیی موءودۃ ¹ (ترمذی)

جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھپا لیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو موت سے بچا لیا جو زندہ درگور کر دی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے، ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کر دیتا ہے، اس مضمون میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے، اس لیے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیے اس مضمون کا خلاصہ نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"جاننا چاہیے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات، جسم، حسن، ڈیل ڈول، وسعت علم، حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا، ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اس لیے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے، اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے، سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ

¹ یہ تمام حدیثیں ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النہی عن التجسس میں ہیں۔

وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگراں ہے، اس لئے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو، اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہو، اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے اسی کا نام بادشاہی ہے، پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک ہوتے ہیں تو سلطانی کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے، اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے، اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لئے مضر اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے، سلطنت کی خوبیوں کا تمامتر دارومدار نرمی پر ہے، کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو، سخت گیر ہو، لوگوں کے عیوب کی کرید کرے، ان کے جرائم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے، اور لوگ اس سے بچنے کے لئے جھوٹ اور مکر و فریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے، وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے۔ اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو یہ عصبیت بالکل مٹ جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے، ان کے گناہوں سے درگذر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں، اس کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، اس کی محبت میں سرشار ہو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں، پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے۔ سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہی ہے، لیکن اس کے لوازم و توابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں، مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کے معاش کا

خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، جاننا چاہیے کہ جو لوگ بیدار مغز اور تیز فہم ہوتے ہیں اُن میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے، نرمی اکثر سیدھے سادے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے بیدار مغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دور رس ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں اس لیے لوگوں کو تکلیف مالایطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو، اور حاکم کے لئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انھوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں ہے میں نے تم کو صرف اس بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمھارے عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

ابن خلدون نے ان سطروں میں جو آئینِ جہانبانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرزِ عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پروائی اور احکامِ سلطنت کے عدمِ تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے، اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے وہ سراسر مذہبی ہے، اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لیے جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں

امن واطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول ملحوظ رہا ہو، عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اونچے اور نیچے قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثباتِ جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

ان اللّٰہ یعذب الذین یعذبون فی الدنیا۔	بے شبہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔

صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیضِ صحبت اٹھایا تھا انھوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا، ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گذر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی دھوپ میں کھڑے کیے گئے ہیں، انھوں نے اس کی وجہ پوچھی، لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے، انھوں نے کہا: میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔[1]

دنیوی حکمراں لطف و محبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں،

---

[1] مسلم ج ۲ ص ۳۹۷، کتاب الادب۔

غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوم کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا، بلکہ لطف و محبت اس کا خمیر تھا، اور اس لئے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا، معاملات حکومت میں خود آپ کا طرز عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کر دیں گے مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فیاضانہ طرز عمل کا اعتراف تھا، چنانچہ یہودیوں میں دو مرد و عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کو لے چلنا چاہئے، کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں[1] یعنی سزاؤں میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے، آپ نے پوچھا: کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے دریافت فرمایا: کیا ہمارے ساتھ نماز پڑھی تھی؟ اس نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا: جاؤ خدا نے معاف کر دیا[2] لوگوں کے حوائج اور ضروریات کا اس قدر خیال فرماتے تھے کہ ایک لونڈی بھی جہاں

[1] ابو داؤد ج ۲ ص ۲۴۹، کتاب الحدود۔ [2] ابو داؤد ج ۲ ص ۱۴۳، کتاب الحدود، جو قصور ان سے ہوا تھا وہ حد کے قابل نہیں تھا اس لئے بحکم ان الحسنات یذهبن السیئات اس قصور کی معافی کی خوشخبری دی گئی۔

چاہتی آپ کو اپنے کام کے لئے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی، ایک بار ایک مخبوط الحواس عورت آئی اور
کہا کہ مجھے آپ سے ایک ضرورت ہے، آپ نے فرمایا تم اپنے کام کے لئے مدینہ کی جس گلی
میں لے چلو میں چلنے کو تیار ہوں، چنانچہ آپ اس کے ساتھ گئے اور اس کے کام کو انجام دیدیا۔[1]
عدی بن حاتم جو مذہباً نصرانی اور طے کے رئیس تھے اور رومی درباروں میں رہ چکے تھے،
جب وہ حاضر خدمت ہوئے تو ان کو شک تھا کہ آیا حضورؐ بادشاہ ہیں یا نبی ہیں، لیکن جب
ان کی نگاہ کے سامنے سے یہ منظر گذرا تو کہہ اٹھے کہ حضورؐ بادشاہ نہیں، کیونکہ یہ حسن خلق تو نبی ہی
میں پایا جا سکتا ہے، اور اس کے بعد فوراً آپ کی نبوت پر ایمان لے آئے۔

متعدد واقعات اوپر ایسے گذر چکے ہیں کہ دیہات کے اعراب آپ کی خدمت اقدس
میں آتے تھے اور نہایت بے تکلفی بلکہ بے باکی کے ساتھ سوال و جواب کرتے تھے، اور حضورؐ
ان کے ساتھ رفق و ملاطفت کا برتاؤ کرتے تھے، ایک بدو نے ایک دفعہ آپ کی چادر پکڑ کر
کھینچی تو آپ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے اور اس کو عطیہ دیا۔[2] بعض لوگوں سے اس قسم کے
گناہ ہو جاتے تھے جن کے لئے ان کو مالی کفارہ ادا کرنا ضروری ہوتا تھا، لیکن ان میں ایسے
لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنے افلاس اور تنگدستی کے سبب خود کوئی مالی کفارہ ادا نہیں کر
سکتے تھے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت المال سے ادا فرما دیتے تھے، ایک صحابی نے
اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے، اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی
کہ انھوں نے اپنی بیوی سے رمضان بھر ظہار[3] کر لیا، لیکن آخر ایک رات کو بے قابو ہو کر

۱؎ مسلم ج ۲، ص ۲۹۳ ۲؎ بخاری ج ۲ ص ۹۰۰ ۳؎ ظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرمات شرعی سے تشبیہ

بیوی سے مباشرت کرلی، صبح کو گھبرا کر انھوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو، سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر جرم کا اعتراف کیا، آپ نے دوبار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟ انھوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی: ہاں، ہاں! یارسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو کہا ہے آپ حکم فرمائیں، فرمایا: ایک غلام آزاد کردو، انھوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یارسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں، آپ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو، عرض کی یارسول اللہ جو پیش آیا وہ تو روزے ہی کا نتیجہ ہے، آپ نے فرمایا: تو پھر ساٹھ مسکینوں کو ایک وسق کھجور دو، عرض کی یارسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے، آپ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقۂ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ، وہ تم کو اس قدر کھجور دے دے گا کہ ۶۰ ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ، وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ ہم نے تمھارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبہ نے رحجان یہ پیدا کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

(بقیہ صفحہ ۱۱۷) دیدی جائے۔ جیسے کوئی کہے آج سے تو میری ماں کے برابر ہے، اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے کہ اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، ابوداؤد ج ۱ ص ۲۰۲ کتاب الطلاق

اس قدر شفتگی پیدا کر دی تھی جس کی جھلک سلاطین وغیرہ کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آسکتی، عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ انہی کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو انہی خودسر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا' اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہد نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا، سر پریشان، بال بکھرے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے، فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو، پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوۃ کو ذکر فرمایا، اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو، اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم میں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضور نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہو گیا اگر سچا نکلا (بخاری۔ کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہؓ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آکر کہا: آپ کے قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں اور آپ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا، اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟

فرمایا: اللہ تعالیٰ نے۔ اس نے کہا: زمین اور پہاڑ کس نے بنائے؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے پھر کہا: اچھا تو ہمارے خاندان کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: اللہ عزوجل نے، اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا، اور پہاڑ کو کھڑا کیا، اور ان میں فائدے رکھے، کیا سچ اللہ ہی نے آپ کو بھیجا ہے؟ فرمایا: ہاں! اس نے پھر عرض کی کہ آپ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں، اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا، کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو بھیجا، کیا خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: بے شک! پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ بھی ہے؟ فرمایا: ہاں! سچ کہا، اس نے کہا: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کہا: آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا کہ قدرت ہو تو خانہ کعبہ کا حج کریں، فرمایا: ہاں! سچ کہا، عرض کی: اس کی قسم جس نے آپ کو بھیجا، کیا خدا نے اس کا حکم دیا؟ فرمایا: ہاں! اس نے عرض کی: قسم ہے اس کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا۔ ارشاد ہوا: اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا (بخاری)

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ٹیک لگائے تشریف فرما تھے اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور سواری مسجد میں داخل ہوا، پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا، پھر مجمع کے پاس آکر پوچھنے لگا: تم میں محمد کون ہیں؟ لوگوں نے

کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں، اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے کے بیٹے! حضور نے فرمایا: ہاں کہو! اس نے کہا کہ میں تم سے کچھ پوچھوں گا، اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا، فرمایا: جو چاہو پوچھو، اس نے کہا: میں تمھارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا خدایا ہاں! پھر کہا: خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا خدا ہی نے آپ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا ہے کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہمارے دولت مندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! اس نے کہا: میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ آئے ہیں، اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں، میں ضمام بن ثعلبہ ہوں۔ (بخاری، کتاب الایمان)

ذرا اس سادگی، بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھئے، اسی کے ساتھ شیفتگی و جان نثاری کا ایک اور واقعہ سنئے:

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آئے، صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار تھے، وہ بھی اگر ان بدوؤں کے پاس سے گذرے تو ان کے ساتھ انھوں نے بھی اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عازبؓ ایک صحابی تھے، ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے

نکلے تو بدوؤں میں پہونچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضورؐ کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے (ابوداؤد، کتاب الحدود، ۲ ص ۱۳۹)

رعایا کی وفاداری، خلوص، جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدانِ جنگ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا بڑا حصہ میدانِ جہاد ہی میں بسر ہوا ہے، صحابہؓ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم وایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفارِ قریش کے نمایندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہؓ آپ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے، لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپ کی ریشِ مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہؓ تلوار کے قبضہ سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپ کی ریشِ مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو، عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہوکر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپ کا لعابِ دہن بھی گرتا ہے تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے سبقت کرتا ہے، جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لئے ٹوٹ پڑتے ہیں، جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ ادب اور تعظیم سے آپ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظر جاہ وجلال کو دیکھ کر پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں، میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے

دربار میں بھی گیا ہوں، لیکن میں نے کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدر عزت کرتے ہیں، جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں، جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں، جب آپؐ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لئے پیش دستی کرتا ہے، جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لئے لڑتا ہے، جب آپ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے، لوگ تعظیماً آپؐ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے۔[1]

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپؐ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش خلوص، عقیدت، محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے، انھوں نے کہا:

ایانا ترید یا رسول اللہ والذی	یارسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری
نفسی بیدہ لو امرتنا ان	طرف ہے، اُس ذات کی قسم جس کے
نخیضھا البحر لاخضناھا ولو	ہاتھ میں میری جان ہے، اگر آپ کا
امرتنا ان نضرب اکبادھا	حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے
الی برک الغماد لفعلنا۔	ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے، اور اگر
	حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد[2]
(مسلم کتاب الجہاد باب غزوۂ بدر)	پر دھاوا کریں، تو ہم کر دیں گے۔

---

[1] بخاری ج ۱، ص ۳۷۹، کتاب الشروط [2] یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔

غزوۂ احد میں جب آپ نے کفار کی جمعیت کو ذرہ گردن اٹھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابوطلحہؓ نے حسن الفاظ کے ذریعہ سے آپ کو روکا اس سے زیادہ جوش محبت کی تعبیر کیا ہو سکتی ہے، انھوں نے کہا،

بابی انت وامی لا تشرف	میرے باپ ماں آپ پر قربان آپ
یصیبک سہم من سہام القوم	گردن اٹھا کر نہ دیکھئے، کہیں آپ کو
نحری دون نحرک.	کوئی تیر نہ لگ جائے، میرا سینہ آپ کے
(بخاری کتاب المغازی غزوۂ احد)	سینہ کے سامنے ہے.

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے واقعات تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا چنانچہ غیر قوموں کو عمال نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا، تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں، فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیے آپ نے حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ بن رواحہ کو مقرر فرمایا، وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص تعداد وصول کرنا چاہی، اس پر یہودیوں نے کہا "یہ تو بہت ہے" انھوں نے کہا: اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں، تم لوگ اس کا نصف لے لینا، اس انصاف پسندی سے یہود اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

ھذا الحق بہ تقوم السماء	انصاف اس کا نام ہے اور اسی
والارض قد رضینا ان ناخذ	انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں

بالذی تطلب[1]. جو کچھ تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے

پر راضی ہیں۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی، لیکن انھوں نے کہا: اے دشمنانِ خدا! تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو، خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں جو محبوب ترینِ خلائق ہے، اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں، لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا سکتی، یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں[2]۔

---

[1] ابوداؤد ج ۲، ص ۷۰، کتاب البیوع۔ [2] فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۲۰۔

سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا گیا، اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔[1] اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ علیحدہ حدیں جدائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاصِ نیت کے ہر منظر سے بیزار اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں،

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئینی ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمنیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

اصل دین الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہیگا اور وہ اسلام ہے، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جاسکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو

---

[1] انجیل

یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین ہے جو سرتاپا سلطنت ہے، مگر سلطنتِ الٰہیؑ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سلطنتِ الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے، وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادرِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے جل شانہٗ و تعالیٰ اسمہٗ بادشاہی اسی کی ہے، حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے، دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکمِ الٰہی ہو، یا اس پر مبنی ہو، اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کے سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے، اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرماں روا تھے، آپ کے احکام کی بجاآوری عین احکامِ خدا کی بجاآوری ہے۔

وَمَن یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء: ۱۱)	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ کے جو جانشین اور خلفاء ہوئے اُن میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی، وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرماں روا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی، اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

من اطاع امیری فقد اطاعنی	جس نے میرے امیر کا کہا مانا اس نے

ومن عصی امیری فقد — میرا کہا مانا، جس نے میرے امیر کی نافرمانی

عصانی — کی اس نے میری نافرمانی کی۔[1]

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکام الٰہی کے مطابق سلطنت کا جو کام بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کیا جائے وہ عین دین اور عین عبادت ہے، یہاں تک کہ امراء کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امراء اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعتِ الٰہی ہے بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و نیت سے ہے، خدا کے لئے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لئے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسبِ حکم الٰہی کیا جائے، وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی امارت، حاکم کی حکومت، رعایا کی نگرانی، قاضی کی دادگری، عامل کا عمل، سپاہی کا قتال، مجاہد کا جہاد، محاصل کی ادائی، امراء کی واجبی اطاعت، غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسب احکامِ الٰہی اللہ کے لئے کیا جائے، وہ سب دین اور اطاعت اور موجبِ قربت ہے، سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یادِ الٰہی میں مصروف رہیں، جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے، فرائض و واجبات و مؤکدات کی

[1] صحیح بخاری کتاب الاحکام ج ۲ ص ۱۰۵۷ و صحیح مسلم کتاب الامارۃ ج ۲ ص ۲۲۳ مصر۔

بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض نقش کی بجا آوری میں مصروف رہیں، حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورہ ص میں ہے جس میں چند داد خواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے، قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے، حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں تھا کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت ان کے معاملات کی داد گری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے، اور یہی احساس فرض ہے جس کو حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا گیا۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ. فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ. يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ. وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.	اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) ان کو آزمایا ہے، تو اپنے پروردگار سے انھوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا، تو ہم نے ان کو معاف کر دیا، اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے، اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکم کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو اللہ کے

(ص - ۲) راستہ سے ہٹا دے گا۔

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر اپنے عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسبِ احکامِ الٰہی فرائضِ خلافت کی ادائگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما من امام یغلق بابه دون ذوی الحاجة والخلة والمسکنة الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته وحاجته ومسکنته (ترمذی ابواب الاحکام)	جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند کر لے گا۔
من ولی من امر المسلمین شیئاً فاحتجب دون خلتهم وحاجتهم وفقرهم وفاقتهم احتجب الله عزوجل یوم القیمة دون خلته وفاقته وفقره (مستدرک حاکم کتاب الاحکام ج ۴ ص ۹۳ حیدرآباد)	جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ضرورت و احتیاج کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا۔

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ان احکام کی پیروی یہاں تک کی کہ انھوں نے اینٹ اور چونے کی کوئی چہار دیواری بھی اپنے لئے نہیں کھڑی کی، اور اپنی حق طلب رعایا کے بیچ میں ان کے لئے اجازت حاصل کرنے والے غلاموں کے سوا کوئی اوٹ قائم نہیں کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جو کوفہ کے والی تھے، اپنے رہنے کے لئے ایک محل بنوایا اور اس میں پھاٹک لگایا، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر پہونچی تو انھوں نے خاص طور سے مدینے سے محمد بن مسلمہ کو اس لئے بھیجا کہ اس پھاٹک میں آگ لگا کر چلے آئیں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، وہ سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے وہاں گئے اور پہونچنے کے ساتھ اس پھاٹک میں آگ لگا دی، حضرت سعد ابن ابی وقاص نے ان کو اپنے پاس ٹھہرانا چاہا اور زادِ راہ دینا چاہا تو اس کو بھی قبول نہیں کیا اور سیدھے مدینے واپس چلے آئے۔ (ابن حنبل ج ۱، ص ۵۴ مصر)

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں حملہ آوروں کے خوف سے جب محل میں لوگوں کی آمد و رفت پر روک ٹوک قائم کی اور ایک صحابی نے ان کو اس حکم نبوی سے باخبر کیا تو انھوں نے یہ تدبیر کی کہ پھاٹک پر ایک آدمی کو اس غرض سے مقرر کیا جو اہلِ حاجت پہونچے تو اس کی ضرورت سن کر ان کو مطلع کر دے۔ (ترمذی، ابواب الاحکام)

لے چونکہ اسلام میں کسی کے مکان میں داخل ہونے کے لئے اذن کا حکم ہے اس لئے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور خلفاء نے گھروں کے دروازوں پر نوکر متعین کر رکھے تھے مگر عام پبلک مقامات، مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

قرآن پاک میں بار بار حکام کو عدل و انصاف سے کام لینے اور اپنے ذمہ دارانہ فرائض کی بجا آوری کی تاکید کی گئی ہے خصوصیت کے ساتھ ذیل کی آیتیں اپنے معنی کے عموم کے لحاظ سے فرائض حکومت کی پوری توضیح کرتی ہیں۔

أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ	امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے
أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ	کر دیا کرو، اور جب لوگوں میں فیصلہ
النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ	کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو
إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ	خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے
إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا.	بیشک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے،
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا	مومنو! خدا اور اس کے رسول کی
اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي	فرماں برداری کرو اور جو کوئی تم میں
الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ	صاحبِ حکومت ہیں، ان کی بھی اور
فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَ	اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع
الرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ	ہو تو اگر خدا اور روز آخرت پر ایمان
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ	رکھتے ہو تو اس میں خدا اور اس کے
خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا.	رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو،
	یہ بہت اچھی بات ہے، اور اس کا
(نساء ۔ ۸)	مآل بھی اچھا ہے۔

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہلِ تفسیر کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے، اور یہ بات کہ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق ادا کیا جائے، امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے۔

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا	اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو،
تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ۔ (رحمٰن ۱)	اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اس معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائگی میں پورا انصاف برتا جائے، اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لئے تولتے ہو، اسی پیمانہ سے اپنے لئے بھی تولو۔

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا	پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں
اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَ	پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا
اِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ۔	لیں، اور جب ناپ کر یا تول کر دیں تو
(مطففین ۱)	گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محروم رہے گا، اللہ کی محبت کے مستحق منصف اور عادل پرور ہی ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ۔	اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو
(مائدہ، حجرات ۶)	پیار کرتا ہے۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کے متعلق ارشاد ہے:

وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (آل عمران ۶ - ۱۴۰)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (شوریٰ ۴۰)

بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو، یا عام بندوں کا ہو، یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے تمام مناصب اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے، اور بحسن و خوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ : ۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں

احادیث میں بھی اس کی تصریحات ہیں، ارشاد ہے:

الا ایھا الناس لا یقبل اللہ صلوٰۃ امام حکم بغیر ما انزل اللہ۔ (مستدرک ج ۴ ص ۸۹ کتاب الاحکام)

ہاں اے لوگو! جو امام خدا نے جو قانون اتارا ہے، اس کو چھوڑ کر کچھ فیصلہ کرے اس کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریگا۔

سبب ظاہر ہے کہ نماز بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اور انقیاد کی تمثیل ہے، اب جو شخص ایک طرف اس کامل اطاعت اور انقیاد کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف اس کی صریح مخالفت کا مرتکب ہوتا ہے، وہ منافق ہے، اور اس لئے اس کی نماز یعنی اظہارِ اطاعت

بارگاہ الٰہی میں بے معنی ہے۔

اسی سلسلہ میں ان حدیثوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت و فرماں روائی بھی ایک مذہبی فریضہ ہے، جو لوگ اس فریضے سے حسب احکام الٰہی بخوبی عہدہ برآ ہوں، ان کے لئے آخرت میں رحمت الٰہی کا سایہ ہے، اور جو اس امتحان میں پورے نہ اتریں ان کے لئے وہ سزائیں ہیں جو دوسری زندگی میں ان کے لئے مقرر کی گئی ہیں، فرمایا:

الامام الذی علی الناس راع	وہ امام جو لوگوں پر مقرر ہے، وہ نگران کار
ھو مسئول عن رعیتہ	ہے، اس سے اس کے زیر نگرانی اشخاص
(صحیح بخاری ج ۲، ص ۷۰۵، کتاب الاحکام)	کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ امیر اور امام بڑی ذمہ داریوں کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہیں، اسلامی امامت و خلافت تاج و تخت کی بہار اور عیش و عشرت کا گلزار نہیں، ذمہ داریوں کا خارزار ہے، جو اس سے بسلامت گذر گیا، اس کے لئے دنیا کی سعادت اور نیک نامی اور آخرت کا ابدی آرام و آسائش ہے اور جو اس میں الجھ کر رہ گیا وہ اس دنیا میں بھی ذلیل و بدنام ہوگا اور آخرت میں بھی رسوا و خوار ہوگا۔

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے
یحطھا بنصیحۃ الا لم یجد رائحۃ الجنۃ	اور وہ اس کی خیر خواہی پوری پوری
(بخاری و مسلم حوالہ سابق)	نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقل رضؓ بن یسار ایک صحابی ہیں، ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر

عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا، انھوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمھیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے:

ما من عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ	جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں
یموت یوم یموت وھو غاش	بنائے، وہ مرتے دم اس حال میں
لرعیتہ الا حرم اللہ علیہ الجنۃ	مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ
	غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو
(مسلم، کتاب الامارہ)	حرام کر دے گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہے وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہونچ جاتے ہیں اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے:

ان شر الرعاء الحطمۃ	سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو
(مسلم، کتاب الامارہ)	اپنی رعیت کو توڑ ڈالے۔

تو تو ان میں سے نہ بن، اس نے کہا: آپ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں بھوسی ہیں، فوراً بولے کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا، بھوسی تو اوروں میں تھے، اور ان کے بعد والے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاءؑ فرمایا کرتے تھے، ایک نبی گذر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا نبوت مجھ پر ختم ہوگئی، البتہ خلفاء ہوں گے اور بہت ہوں گے، انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی، صحابہؓ نے عرض کی یا رسول اللہ! تو ہمارے لئے کیا حکم ہے؟ فرمایا: پہلے کی بیعت کرو پھر اس کے بعد والے کی، پھر عہد بہ عہد اوروں کی، ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پرسش خدا پر چھوڑ دو)

فَاِنَّ اللّٰہَ سَائِلُھُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاھُمْ	کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا، جن کی نگرانی اس نے
(صحیح بخاری)	ان کے سپرد فرمائی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعاء فرمائی ہے

اللھم من ولی من امر امتی	اے اللہ! جو کوئی میری امت کی کسی بات
شیئاً فشق علیھم فاشقق علیہ	کا (یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو
ومن ولی من امر امتی شیئاً	اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر
فرفق بھم فارفق بہ۔	سختی کرنا اور جو ان سے مہربانی سے
(مسلم)	پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرمانا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنیٰ افسر تک شامل ہیں، اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرۂ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے۔ ایک اور حدیث پاک میں

اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ فالامیر الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہ والرجل راع اھل بیتہ وھو مسئول عنھم والمرأۃ راعیۃ علی بیت بعلھا وولدہ وھی مسئولۃ عنھم والعبد راع علی مال سیدہ وھو مسئول عنہ الا فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

(مسلم و صحیح بخاری)

ہاں! تم سب نگران کار ہو، اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص (رعایا) کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگران کار ہے اس کے زیر نگراں کے متعلق پرسش ہوگی، اور مرد اپنے گھر والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی اور عورت، اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگراں ہے، اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا، اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے، اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا، تو ہاں ہشیار رہو، تم سب نگران کار ہو اور تم سے اس کے زیر نگراں کے بابت باز پرس کی جائے گی۔

لفظ رعیت | اس موقع پر ایک مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے جو ہماری زبان میں

عام طور پر رائج ہے، اور وہ رعیت ہے، اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے، حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں، یہ الفاظ لفظ "رعی" سے نکلے ہیں، جس کے اصل معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں، راعی چرواہا اور رعیۃ وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے، اس سے ظاہر ہے کہ کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت، پرورش، نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت، ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے، جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لیجاتا ہے، اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے، اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ "رعیت" کس قدر شفقت آمیز اور پُر محبت معنوں میں آیا ہے، اور ظالم و سفاک امراء اپنے عمل سے اس کو کتنے ذلیل اور پست معنوں میں غلط استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اسی لفظ میں ان کی ذمہ داریوں کا ایک بڑا دفتر پوشیدہ ہے، جو امام عادل اپنے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی نسبت یہ بشارت دی ہے:

ان المقسطین عند اللّٰہ علی	بے شک انصاف کرنے والے (حکام)
منابر من نور عن یمین الرحمٰن	(دربار) اللہ تعالیٰ کے پاس نور کے
وکلتا یدیہ یمین الذین	منبروں پر اس کے داہنے ہاتھ پر
یعدلون فی حکمھم واھلیھم	ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے دونوں

وما ولوا۔	ہاتھ داہنے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے فیصلہ میں اپنے اپنے لوگوں میں اور اپنے زیر حکومت امور میں
(صحیح مسلم کتاب الامارہ)	عادل ہوں۔

اس رفعت اور بلندی سے جو ایسے عادل حاکموں، منصف امیروں اور سلطانوں کو قیامت کے روز حاصل ہوگی، ظاہر ہے کہ عادلانہ حکومت اور منصفانہ سلطنت کتنی بڑی عبادت ہے، جامع ترمذی میں ہے:

ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ وادناھم مجلساً امام عادل وابغض الناس الی اللہ وابعدھم منہ مجلساً امام جائر۔ (ترمذی ابواب الاحکام)	بے شبہ سب لوگوں سے خدا کو محبوب اور خدا سے قریب امام عادل ہوگا، اور خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور خدا سے دور وہ امام ہوگا جو ظالم ہو۔

اس کے برخلاف جو امام اور حاکم و امیر عدل و انصاف اور رعایا پروری اور خیر خواہی سے دور ہوں گے، وہ اللہ کی رحمت سے بھی دور ہوں گے۔ فرمایا:

ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم وینصح الا لم یدخل معھم الجنۃ۔	جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو پھر وہ ان کے لیے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں، وہ ان کے ساتھ

(صحیح مسلم، کتاب الامارہ)	بہشت میں داخل نہ ہوگا۔
ما من وال یلی رعیۃ من	کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیرنگرانی
المسلمین فیموت وھو غاش	جماعت کا والی ہو، وہ اس حال میں
لھم الا حرم اللہ علیہ	مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ
الجنۃ۔	غداری کا مرتکب ہو، اس پر جنت
(صحیح بخاری، کتاب الاحکام)	حرام ہے۔
انما الامام جنۃ یقاتل من	امام ڈھال ہے، اس کے پیچھے اس کی
ورائہ ویتقی بہ فان امر	پناہ میں لڑا جاتا ہے، تو اگر وہ اللہ تعالیٰ
بتقوی اللہ وعدل فان لہ	کے تقویٰ کے مطابق حکم کرے اور عدل
بذلک اجرا وان امر بغیرہ	کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملیگا،
فان علیہ وزرا۔	اور اگر غیر تقویٰ کا حکم کرے اور عدل
(نسائی کتاب البیعۃ)	نہ کرے تو اس کے لئے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں، اور وہ بھی ثواب و عذاب اور جزا و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور و اعمال، اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال و عبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں، اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں، کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الٰہی ہیں، یا قوانین الٰہی ہیں

یہ احکامِ الٰہی اور قوانینِ الٰہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں، اس بنا پر سلطنت وولایت اور حکومت وریاست کے کاروبار کا نظم ونسق اور اہتمام و انصرام بھی دینِ الٰہی کا ایک جزء ہے۔

ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیہ کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلایا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل وتدبیر دنیا کا کام ہے، جس سے اہل علم اور اہل اتقا کو کنارہ کش رہنا چاہئے، حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے:

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش ۱؎ — رموز مملکت خویش خسرواں دانند

(اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے، زیادہ شور وغل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں، تم کو ان سے کیا سروکار)

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں، اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجراء کے لئے ہے اور یہ عین دین ہے، اسلام میں جس قتال وجہاد کی دعوت بار بار دی گئی ہے اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں، اور جس سے داعیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مقدس اور حضرات

۱؎ حافظ علیہ الرحمہ کے اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار ومصالح کی تلاش نہیں کرنی چاہئے، جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز ومصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے، اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کے جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الٰہی کے رموز واسرار کی تلاش وطلب نہیں کرنی چاہئے۔

خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کی زندگیاں سرتاپا معمور ہیں اس سے مقصود اصلی احکام الٰہی کی تبلیغ، تنفیذ اور اجرا ہی تھا، جہاد سے فرار پر غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے، اور میدان جہاد کے صبر و ثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے، قرآن میں ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ. (انفال۔ ۲)	اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان سے پیٹھ نہ پھیرنا، اور جو شخص جنگ کے روز اس صورت کے سوا لڑائی کے لیے کنارے کنارے چلے (یعنی حکمت عملی سے دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہے، ان سے پیٹھ پھیریگا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔
وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ. (بقرہ۔ ۲۲)	اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں، یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ، انصاف، اقامت دین، تنفیذ حکم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جن کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور صیغوں سے متعلق ہے، عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامت دین کی راہ میں خونِ شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے، حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے،

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ	تو جو لوگ میرے لیے وطن چھوڑ گئے
دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ	اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور
وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ	ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے
عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ	میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور
جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا	ان کو بہشتوں میں داخل کر دوں گا،
الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ	جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں،
وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ	یہ خدا کے ہاں سے بدلہ ہے، اور
(آل عمران۔ ۲۰)	خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے، ان میں سے ایک معنی احکام الٰہی کی اطاعت، تنفیذ اور اقامت کے بھی ہیں، سورۂ نور میں ہے:

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ	اور ان دونوں مجرموں کے ساتھ

فِی دِیْنِ اللّٰہِ ۔ (نور ۔ ۱) اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آوے۔

کھلی بات ہے کہ "اللہ کے دین" سے مقصود یہاں احکامِ الٰہی کی تنفیذ و اجراء سے ہے، اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ ۔ (بقرہ ۔ ۲۴)

اور ان سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو "دین" فرمایا گیا ہے، سورہ انفال کی اس آیت میں:

وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ ۔ (انفال ۔ ۵)

اور ان لوگوں سے قتال کرتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے

بھی حکم و قانونِ الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا ہے، یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے، اسی کا ایک فیصلہ ہے جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (انعام)(یوسف) اَلَا لَہُ الْحُکْمُ (انعام) ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَہُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ۔ (نحل ۔ ۷)

اور اسی خدا کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اسی کی لازمی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکامِ الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظمِ قرآنی کے

مطابق ہے۔

سلطنت و ملکیت کی حقیقت اب دین کی تشریح کے بعد حکومت و سلطنت و ولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، عام لوگ حکومت و سلطنت کو عیش و تنعم کے ایوانِ زرنگار، تاج اور زمردیں تخت کی روشنی اور زریں کمربند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں، یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواروں کے سایے میں، لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ان تمام مناظر سے قطعاً خالی ہے۔

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے سلطنت و حکومت اور ولایت و ریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے تصورات میں اصلاً نہیں ہے، بلکہ اسلام نے سلطنت، حکومت اور بادشاہی و شہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے قطعاً چھوڑ دیا، سب سے عام لفظ ملک کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا، ایران کے شہنشاہ و کسریٰ اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے، مگر تعلیم محمدیؐ نے ان سب لفظوں سے جو جبر و قہر اور ظلم و ستم کے مظہر تھے، پرہیز کیا، الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی ہے، اس لئے اس لفظ سے بھی پرہیز کیا، اسلام کی تعلیم میں حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے "الملک" ہونے کا استحقاق اسی کو ہے، چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ وصف بار بار بیان ہوا ہے:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۔ کہو کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ

مَلِكِ النَّاسِ إِلٰهِ النَّاسِ	مانگتا ہوں لوگوں کے حقیقی بادشاہ کی
(الناس ۔ ۱)	لوگوں کے معبود برحق کی ۔
الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ ۔	بادشاہ حقیقی پاک ذات (ہر عیب)
(حشر ۔ ۳)	امن و امان والا ۔
فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۔	تو خدا جو سچا بادشاہ ہے ۔
(مومنون ۔ ۶)	
الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ الْعَزِيزُ	بادشاہ حقیقی ، پاک ذات ، زبردست
الْحَكِيمُ (جمعہ ۔ ۱)	حکمت والا ۔

یہ آیت قرآن پاک میں چھ جگہ آئی ہے اور ہر جگہ اللہ تعالیٰ ہی کو الملک کہا یعنی بادشاہ برحق فرمایا گیا ہے ۔ یہاں ایک نکتہ خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے ، ان آیتوں میں کہیں بھی تنہا الملک نہیں آیا ہے ، بلکہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت یا اضافت ضرور لگائی گئی ہے ، مثلاً اوپر کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کو ملک الناس "لوگوں کا بادشاہ" کہا گیا تو ساتھ ہی اس سے پہلے رب الناس "لوگوں کا پالنہار" بھی کہہ دیا گیا ہے تاکہ اس کی ربوبیت کا بھی اظہار ہو ، دوسری آیت میں الملک کے ساتھ اول القدوس (مقدس و پاک) اور پھر السلام (امن و امان والا) کہا گیا ، تاکہ اس کے ساتھ اس کی پاکی و سلامتی ظاہر ہو جائے ، تیسری آیت میں الملک کے ساتھ الحق برحق کی صفت آئی ہے ، چوتھی آیت میں الملک کے ساتھ القدوس (پاک) العزیز (غالب) الحکیم (حکمت والا) کی صفتیں آئی ہیں ، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الملک کے

لفظ کے اندر ظلم و سفاکی، قہر و جبر اور بد بختی و سخت دلی کا ایسا مفہوم ذہن انسانی میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضرور لگا دی ہے۔

لفظ ملک الملوک کی ممانعت عربی میں ملک الاملاک یا ملک الملوک اور فارسی میں شاہنشاہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہت کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے، اسلام میں شاہِ شاہاں، شہنشاہ، ملک الملوک صرف ایک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا:

ان اخنع الاسماء عند اللہ	سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک
رجل تسمی ملک الاملاک	یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ
(صحیح بخاری، کتاب الادب)	کہے۔

معانی جن الفاظ سے ادا کئے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہوگا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے، اسلام کی زبان میں اپنی طرز حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ، اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے، خلیفہ عربی زبان میں قائم مقام اور نائب کو کہتے ہیں، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرماں روا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے، سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائم مقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے، مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں، توراۃ میں یہ بیان صرف حضرت آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے، لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کے دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے، اسلام میں ایک طرف تو انسان کا مکلف ہونا، اس کا اصلی مقام بہشت ہونا، جزا وسزا کا راز، رسالت و نبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصے سے ظاہر ہوتی ہے، دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام و مرتبہ کی تعیین، دنیا میں اس کے فرائض، احکام الٰہی کی بجاآوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہوتی ہے، پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔[1]

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ	اور جب تیرے پروردگار نے
جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً۔	فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک
(بقرہ - ۴)	خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے جو تمام بنی آدم کے قائم مقام ہو کر اس شرف سے ممتاز

---

[1] خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر متوجہ ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں حقیقت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

ہو گئے، اس لیے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے بجائے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ	ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ	عزت بخشی، اور ان کو خشکی اور تری میں
مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ	ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں
عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا	روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی
(بنی اسرائیل - ۷)	مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف و امتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قائم مقام تھے، ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغۂ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا فَإِمَّا	تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ، اب
يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ	اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے
هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	کوئی پیغام رہنمائی آئے تو جو میری اس ہدایت
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ.	کی پیروی کریں گے، تو ان کو نہ کوئی ڈر
(بقرہ - ۴)	ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورۂ اعراف میں ارشادِ الٰہی ہے:

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ	اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی
وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ	اور اس میں تمہارے لیے سامان معیشت بنائے

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ. وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ لَمْ يَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ.

(اعراف - ۲)

معاشی طریقے بنائے، تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا، پھر تمہاری صورتیں بنائیں، پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں نہ تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی، اس لئے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو صورت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی، سورۂ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ

(انعام - ۲۰)

اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں خلیفہ بنایا اور (تم میں سے) ایک کا دوسرے پر درجہ بڑھایا، تاکہ تم کو جو دیا اس میں تم کو آزمائے، بیشک تیرا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور وہ بے شبہہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یہاں پہونچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی آدم کو یہ خلافت یا نیابت کس کی عطا کی گئی ہے؟ قرآن پاک میں ایک قوم کے بعد دوسری قوم کو نیابت اور جانشینی عطا ہوتی رہی ہے، جیسے عاد کی قوم کو حضرت نوحؑ کی قوم کا جانشین، فرمایا:

وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ	اور یاد کرو کہ اللہ نے تم کو نوحؑ کی قوم کے
مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ (اعراف ۹)	بعد جانشینی بخشی۔

اور پھر ثمود کو عاد کا جانشین بنایا۔

وَاذْكُرُوٓا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ	اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد
بَعْدِ عَادٍ (اعراف ۱۰)	نیابت بخشی۔

حضرت ہودؑ اپنی قوم عاد کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری نہ کی

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّى قَوْمًا غَيْرَكُمْ	تو میرا رب تمھارے علاوہ کسی اور
(ہود - ۵)	قوم کو خلافت بخشے گا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ارشاد ہے۔

إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ	اور خدا چاہے گا تو تم کو لے جائیگا
مِنۢ بَعْدِكُم مَّا يَشَآءُ كَمَآ	اور تمھارے بعد جس کو چاہے خلافت
أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ	و نیابت دے جس طرح تم کو دوسرے
ءَاخَرِينَ (انعام ۱۶)	لوگوں کی نسل سے پیدا کیا۔

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	اللہ نے تم میں سے ان سے جو
مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	ایمان لائے اور اچھے کام کئے،
لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا	وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت
اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ	بخشے گا، جس طرح تم سے پہلوں کو
(نور - ۷)	خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا:

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ	اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین کے
الْاَرْضِ (فاطر - ۱۶)	جانشین بنائے۔

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

وَلَقَدْ اَھْلَکْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ	اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو جب
قَبْلِکُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْھُمْ	انھوں نے ظلم اختیار کیا، ہلاک کر چکے
رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ وَمَا کَانُوْا	ہیں اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں
لِیُؤْمِنُوْا کَذٰلِکَ نَجْزِی	لے کر آئے، مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان
الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ	لائے، ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح
خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْ	بدلہ دیا کرتے ہیں، پھر ہم نے ان کے
بَعْدِھِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ	بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں

(یونس - ۲)

کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوح کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

فَكَذَّبُوهُ فَنَجَّيْنَاهُ وَمَن مَّعَهُ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنَاهُمْ خَلَائِفَ. (یونس - ۸)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوح) کی تکذیب کی تو ہم نے ان (نوح) کو اور جو ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو طوفان سے بچا لیا اور انھیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ فَمَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ. (فاطر - ۴)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا، تو جس نے کفر کیا، اس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے

حضرت داود کو خلافت بخشی گئی:

يَا دَاوُودُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ. (ص - ۱)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے، تو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خَلَف سے مشتق ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے ایک کی غیر موجودگی میں، خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب سے ہو، یا آنکھوں سے غائب

اوجھل ہونے کی صورت میں ہو، اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے، قرآن پاک میں ہے:

۱۔ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (اعراف ۲۱) — تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے، دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

هٰرُوْنَ اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ۔ (اعراف ۔ ۱۰) — ہارون تم میری قوم میں میرے جانشین یا نائب ہو۔

یہ زندگی ہی میں جانشینی کی ایک شکل ہے۔

۲ ۔ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ (زخرف ۔ ۶) — اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے، پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں، اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے، بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا، اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے

جانشین ہوتے چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ خلافت کے اصلی معنی نیابت اور قائم مقامی کے ہیں، لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافة النيابة عن	خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے
الغير اما لغيبة المنوب	کے ہیں، اب یہ نیابت اصل کی عدم
عنه واما لموته واما	موجودگی کے سبب سے ہو، یا اس کی
لعجزه واما لتشريف	موت کے سبب سے ہو، یا اس کے
المستخلف	اپنے منصب سے عاجز ہونے کے
	سبب سے ہو، یا نائب کو نیابت کی
(ص ۱۵۵ مصر)	عزت بخشنے کے لئے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں، مفتی آلوسی زادہ صاحبِ روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے تینوں معنوں کے لئے مختلف قول نقل کئے ہیں، اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں، میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود اسی متکلم کی جانشینی

اور قائم مقامی ہوگی، اس اصول پر قرآن پاک کی ہر اس آیت میں جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے اسی کی جانشینی مراد ہوگی، اور جہاں تصریح نہیں ہے، وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی، جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

وَاَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۔ (حدید - ۱)

اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا ہے،

اب اس آیت میں یہ ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے، اس لئے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں، کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا، جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے، کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ملک ہے، اس نے جس کے حوالہ اپنے مال و دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امور خیر میں اس کو صرف کرے، میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں، کشاف، بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا ہے، کشاف میں ہے:

ان الاموال التی فی ایدیکم انما ھی اموال اللہ بخلقہ و انشاءہ لھا وانما مولکم ایاھا وخولکم للاستمتاع بھا. وجعلکم خلفاء فی

وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے، (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے، کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے اسی نے تمہارے تمتع کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے اور تم کو اس کے

التصرف فیہا.	تصرف کا اختیار بخشا ہے.

بیضاوی میں ہے:

من الاموال التی جعلکم اللہ	وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ
خلفاء فی التصرف فیہا.	تم کو جانشین بنایا ہے.

روح المعانی میں ہے.

جعلکم سبحانہ خلفاء عنہ	اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس
عزّ وجلّ فی التصرف فیہ	(مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے
من غیر ان تملکوہ حقیقۃً.	نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو.

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کے نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں.

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں، جو اس باب کا سرعنوان ہے یعنی

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ	اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے
جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً.	کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ
(بقرہ - ۴)	بنانے والا ہوں.

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک

یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت کے حوالہ سے لکھا ہے:

إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً	میں اپنی طرف سے زمین میں ایک
مِنِّي يَخْلُفُنِي فِي الْحُكْمِ	خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا
بَيْنَ خَلْقِي (حدیث)	میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

ان اللہ تعالیٰ اخبر الملئکۃ	اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے
انہ جاعل فی الارض خلیفۃ	کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے
لہ یحکم فیہا بین خلقہ	جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوق
بحکمہ (ص ۱۰۴، مصر)	میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد بہ آدم علیہ السلام	اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں
لانہ کان خلیفۃ اللہ تعالیٰ	کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ
فی ارضہ وکذلک کل نبی	کے خلیفہ تھے، اور اس طرح اللہ تعالیٰ
استخلفہ فی عمارۃ الارض	نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی
وسیاسۃ الناس وتکمیل	اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل

نفوسهم وتنفيذ امره فيهم لاحاجة به تعالٰی الی من ينوبه بل لقصور المستخلف عليه عن قبول فيضه و تلقی امره بغير وسط،	اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو، بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گذری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے بنی آدم کو خلفاء فرمایا ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافتِ الٰہی کی سند ان کے تبعین تک کو عطا ہوئی ہے اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا، اس لحاظ سے آدمؑ کی تخلیق کوئی نئی بات نہ تھی، لیکن جس اہتمام سے جس شان سے اور جس اہمیت سے حضرت آدمؑ کی پیدائش اللہ کی نیابت، فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ، پھر ان کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلۂ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات وفضائل جو بیان کئے گئے ہیں، ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا، یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گذشتہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی تھی۔

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول ممہد کیا گیا ہے، اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی، اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی، جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ ہم نے زید کو نائب بنایا، اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے، یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی، اور اگر اس توضیح سے کلام کلیۃً خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے، اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے جس کا آدم کو نائب بنانا سمجھا جائے، ایسی حالت میں بلاشبہہ خود اپنا نائب بنانا متعین ہو جائے گا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جن سے آدم اور بنی آدمؑ کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے، فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ	ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ	عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ	ہم اٹھائے ہیں، اور ان کو پاک
عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا	چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو
(بنی اسرائیل ۷)	اپنی بہتیری مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِی اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (تین - ۱)	ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لیے بنا ہے، اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْہُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ۔ (جاثیہ - ۲)	اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں، اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بےشک اس میں ان لوگوں کے لیے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں۔

اور یہی نیابتِ الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقاتِ الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور اسی کے لیے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے مزید تشریح کے لیے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

وَخَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ (بقرہ - ۳)	اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیے پیدا کیا۔
وَھُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ۔ (نحل - ۲)	اور وہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے اختیار میں کیا۔
اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ	اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے

(جاثیہ - ۱)	قابو میں کر دیا
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ .	اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے
(ابراہیم ۱ - ۵)	زیر فرمان کر دیا .
وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (ابراہیم ۵)	اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا .

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان اس کائنات کا مقصود اصلی ہے، اور اسی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے، اور یہی خلافتِ الٰہی کا منشا ہے، ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ	ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ	زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا، تو
اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا	انھوں نے اس کے اٹھانے سے
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ	انکار کیا اور اس سے ڈر گئے، اور
ظَلُوْمًا جَهُوْلًا .	انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک
(احزاب - ۹)	وہ ظالم اور جاہل تھا .

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابتِ الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے، یہ امانت الٰہی کیا ہے، یہ اسی نیابت و خلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے، نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ

صرف مالک کی امانت ہے، جو اس کو ملی ہے، تاکہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے، اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات و محاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لئے عاریت ملے ہیں، یہ حدیث کہ فَاِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے) اسی معنی کی طرف مشیر ہے، اور مشہور قول تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریۂ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی ہے، جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطہ تک پہونچاتا ہے، اور جس کے اندر مادی و روحانی، سیاسی اور اخلاقی، دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریباں ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (میں نے انسان اور جن کو اسی لئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے، اس کے ہاتھ میں شریعت الٰہی کا فرمان ہے، اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجالانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے، وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

اُمتِ مسلمہ کی بعثت

عقیدۂ خلافت کے رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابت الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمایندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جب کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لئے خاتم الانبیاء ہوکر تشریف لائے ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امت محمدیہ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابتِ الٰہی کی نمایندہ ہے، اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمایندہ رہے گی، اسی لئے قرآن پاک اور احادیث نبویؐ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی پچھلوں کے ہیں۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْآخِرِينَ (واقعہ - ۱)

ایک بڑا گروہ اگلوں میں اور ایک بڑا گروہ پچھلوں میں سے۔

وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ (جمعہ - ۱)

اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ امتِ محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریح کافی موجود ہیں، صحیح بخاری میں ہے کہ انبیاء کی ان امتوں کی مثال مزدوروں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انھوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ نہ مانے، پھر نصاریٰ کو مزدور مقرر کیا، انھوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے، مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے، عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کا بخشا تو انھوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہونچا دیا اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری و ترمذی و موطا و حاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے (کنز ۶ - ۲۳۰)

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے، اس سے واضح ہے کہ امتِ مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے، صحیح بخاری[1] و مسلم و نسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے:

نحن الاٰخرون السابقون۔ ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں، لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے، حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم، بیہقی اور نسائی میں بھی ہے (کنز ۶ - ۲۳۰)

ابن ماجہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التعبیر

نحن آخر الامم (کنز: ۶۔ ۱۴۲۰)   ہم سب سے آخری امت ہیں۔

غرض ان آیات و احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امتِ محمدیہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے اس لئے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب و منصور رہے گا، جو دنیا پر اللہ تعالیٰ کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور اہل عذر کی حجت کا قاطع ہو گا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا، اب ظاہر ہے کہ اس کے حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کر دے گا۔ گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے، مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لئے اسباب و علل کا واسطہ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا۔ اس کے بعد پورا فرمایا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے تو وہ بھی اسباب و تدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہو گا۔ اسی لئے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لئے حاملین قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا، اور

انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا، اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے، ارشاد الٰہی ہے:

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّۃٌ	ہمارے مخلوق بندوں سے ایک
یَّھْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِہٖ یَعْدِلُوْنَ	امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور
(اعراف - ۲۲)	حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہیگی)

اہل تفسیر نے اس کو امت محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لیے ہے، یعنی قیامت تک امت محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا[1]۔

قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ	اور تمہارے پیرووں کو تمہارے
فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْآ اِلٰی	نہ ماننے والوں پر قیامت تک غالب
یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (آل عمران - ۵)	رکھوں گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں، گو دوسرے کفار بھی تبعاً اس میں داخل ہیں، اسی طرح ان کے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں[2]، مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں وہ بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں، اگو گمراہ ہوں[3]، بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے

---

[1] تفسیر خازن تفسیر آیت مذکورہ [2] تفسیر ابن جریر تفسیر آیت مذکورہ [3] تفسیر روح المعانی، تفسیر آیت مذکورہ۔

اہلِ اسلام اور ان کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک دنیا میں قائم رہنے والے ہیں، اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں، یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبۂ عام حاصل ہو جائے، جیسا کہ نزولِ مسیح علیہ السلام کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے۔

لا تزال من امتی امۃ قائمۃ بامر اللہ لا یضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتیھم امر اللہ وھم علی ذلک (بخاری، علامات النبوۃ)	میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا، اس کے چھوڑنے والے اور اس کے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی بات یعنی قیامت آجائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔
لا یزال ناس من امتی ظاہرین حتی یاتیھم امر اللہ وھم ظاہرون (بخاری، علامات النبوۃ)	میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے، یہاں تک کہ خدا کی بات یعنی قیامت آجائے گی۔
لا یزال من امتی قوم ظاہرین علی الناس حتی یاتیھم امر اللہ	میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت

(بخاری، کتاب التوحید)

آجائے گی۔

لا یزال من امتی امة قائمة بامر اللہ لا یضرھم من کذبھم ولا من خذلھم حتی یأتی امر اللہ وھم علی ذلک۔

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہے گا، اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہونچا سکیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

(بخاری، کتاب التوحید)

لا تزال طائفة من امتی ظاہرین علی الحق لا یضرھم من خذلھم حتی یأتیھم امر اللہ وھم کذلک۔

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہانتک کہ قیامت آجائے گی۔

(مسلم، کتاب الامارة)

لن یبرح ھذا الدین قائما یقاتل علیہ عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعة۔

(مسلم کتاب الامارة)

یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا، اس کیلئے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاہرین الی یوم القیامة۔ (مسلم، کتاب الامارة)

میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے گا، اور اپنے دشمنوں پر غالب رہیگا۔

لاتزال طائفۃ من امتی قائمۃ بامر اللہ لایضرھم من خذلھم اوخالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم ظاھرون علی الناس

(مسلم، کتاب الامارۃ)

میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکام الٰہی کو مضبوط تھامے قائم رہیں گے، ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہونچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی، اور وہ غالب رہیں گے۔

ولاتزال عصابۃ من المسلمین یقاتلون علی الحق ظاھرین علی من ناواھم الی یوم القیٰمۃ۔

(مسلم کتاب الامارۃ)

مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی، اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔

لاتزال عصابۃ من امتی یقاتلون علی امر اللہ قاھرین لعدوھم لایضرھم من خالفھم حتی یاتیھم الساعۃ وھم علی ذٰلک۔

(مسلم، کتاب الامارۃ)

میری امت کی ایک جماعت خدا کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی رہے گی، اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہونچا سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے، اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں، حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں[1]، اس سے

[1] دیکھئے کنز العمال ج ۶ ص ۲۳۱ و ص ۲۳۵۔

اندازہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری تسکین خاطر کے لیے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرمادی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک باقی رہے گا، تاکہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ادا ہوتا تھا، وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی، ایک حدیث ہے العلماء ورثۃ الانبیاء[1]، یعنی امت محمدی کے علماء انبیاء کے وارث ہیں، ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا، بلکہ نبوت کے فضائل و کمالات و فرائض سے ان کے حسبِ استعداد و مرتبہ حصہ ملے گا، اور وہ تبلیغِ دین، ہدایتِ خلق، دعوتِ حق، اقامتِ دین، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، دفعِ شبہات، ابطال مبطلین اور رد بدعات وغیرہ ہیں، اور وہ بھی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں، چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی تو یہ امتیں بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی:

[1] یہ حدیث مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں بطرق متعددہ مروی ہے، اور محدثین نے اسی لیے اس کو معتبر مانا ہے، دیکھئے مقاصد حسنہ سخاوی و کشف الخفا عجلونی ص ۶۴۔

کادت ھذہ الامۃ ان تکون انبیاء کلھا۔ (مسند طیالسی، ص ۳۴۳، عن ابن عباس رض و مسند احمد و ابویعلیٰ)	قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں۔

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی اللہ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوات اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے، صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت محمدیہ سے لیا جائے گا[1]، یہ شاید اس لئے ہوگا کہ امت محمدیہ ہی وہ امت ہے جو سارے پیغمبروں کی صداقت پر ایمان لائی ہے۔

حضرت عبادہ رض بن صامت سے حکیم ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے، "اس امت کو ایسی باتیں ملی ہیں جو کسی کو نہیں ملیں، ان میں سے ایک یہ کہ اس امت سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ ؕ (مومن - ۶)	مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا، یا مجھ سے مانگو میں دعا قبول کروں گا

حالانکہ یہ مرتبہ پہلے صرف انبیاء کو حاصل تھا، اور دوسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ	اللہ تعالیٰ نے دین میں تم پر کوئی تنگی

---

[1] حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لتکونوا شہداء علی الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

مِنْ حَرَجٍ. (حج - ۱۰) نہیں کی.

اور یہ بھی صرف انبیاء کو کہا گیا تھا، اور تیسری یہ کہ ان سے کہا گیا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا — ہم نے تم کو بیچ کی امت یا شریف و معزز

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (بقرہ-۱۷) — امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر شاہد ہو.

یہ بھی پہلے صرف نبیوں سے کہا گیا تھا کہ تم اپنی امت پر شاہد ہو.

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس روایت میں امت محمدیہ کی جو پیغمبرانہ فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، وہ درحقیقت قرآنی آیتوں سے مؤید ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں یہ مضمون دہرایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کو شہادۃ علی الناس اور شہادۃ علی الامم کی فضیلت بخشی گئی ہے.

"شہید" اور "شاہد" کے لغوی معنی "حاضر" کے ہیں، کسی شخص کا کسی شخص کے پاس حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہو سکتا ہے، مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لئے، اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لئے، اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لئے، اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس کے دعویٰ کی تائید کے لئے، اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لئے، اسی لئے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان تمام معنوں میں حسب سیاق و سباق بولا جاتا ہے، جس کا اندازہ حسب ذیل آیتوں سے ہوگا:

۱. حمایتی اور مددگار کے معنی میں:

وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ — اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ

دُوْنِ اللّٰہِ ۔ (بقرہ ۔ ۳) (کہ قرآن کا جواب لائیں)

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَہِیْراً — اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے
(بنی اسرائیل ۔ ۱۰) — مددگار ہوں۔

۲۔ ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے والے کے معنی میں:

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ۔ — اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔
(حج ۲)

اس معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

۳۔ کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَہِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ (مائدہ ۔ ۱۶) — (حضرت عیسٰیؑ فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر جب تک ان میں رہا نگراں رہا

۴۔ گواہ اور دعوی کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَہِیْدًا۔ (نساء ۔ ۶) — بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔

۵. امور خیر کی تعلیم یا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے والے کے معنی میں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً	اور اسی طرح ہم نے تم کو معتدل امت بنایا
وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ	تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو، اور
عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ - ۱۷)	

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	تو سب کی رہنمائی کو حقیقی امتیں ہوئیں
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	بتاتے ہو، اور بری باتوں سے
(آل عمران - ۱۲)	روکتے ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے، اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے وہ ہر نبی کے دعوی کی شاہد، حامی، مددگار اور گواہ ہے، وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے، اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ دین الٰہی کامل ہو چکا، پیغام الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امتِ محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے، اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ

قیامت تک تمام دنیا میں کلمۂ الٰہی کی بلندی، حق کی اشاعت، دین کی تبلیغ، نظامِ عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے، رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن اس کی یہی فضیلت تمام انبیاءؑ کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ بلائے جائیں گے وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے ہاں! میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انھوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ میرے پاس تو کوئی ڈر سنانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا، تمہارے دعوی کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے، محمد اور ان کی امت، تو یہ نوح کی شہادت دیں گے، یہ ارشاد فرما کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا الخ (یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تاکہ تم لوگوں کے گواہ رہو اور رسول تم پر گواہ ہو) (صحیح بخاری تفسیر سورۂ بقرہ)

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر

کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جزء ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورۂ حج میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ	اسی اللہ نے تم کو (اے امت محمدیہ) تم کو
فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ	(ساری امتوں) میں چنا ہے، اور
اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ	اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں
الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا	رکھی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین، اسی نے
لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ	تمہارا نام مسلم پہلے رکھا، اور اس
وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۔	قرآن میں بھی، تاکہ رسول تم پر گواہ ہو
(حج - ۱۰)	اور تم لوگوں پر۔

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں، اُمَّةً وَّسَطًا، (عادل و معتدل امت) خَيْرَ اُمَّةٍ (سب سے بہتر امت) هُوَ اجْتَبٰكُمْ (تم کو خدا نے چنا) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی، برتری اور فضیلت پر شاہد ہیں، بلکہ وصف اجتباکم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو قیامت تک کے لئے آخری نبی بنا کر

بھیجے گئے ہیں، اس لئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں، وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں دعوت کے اس فرض کو انجام دیا، آپ کے بعد عہد بعہد قیامت تک اس پیغام الٰہی کی دعوت وتبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا، جب تک دنیا آباد ہے، ہر ملک میں، ہر قوم میں، دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الٰہی کی دعوت وتبلیغ تا بہ قیامت امت محمدیہ کا فریضہ ہے، یہی بعض علمائے محققین کی اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حسب ذیل فرمائی ہے:

"تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے، تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔" (باب حقیقۃ النبوۃ)

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام وتعلیمات وآداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے، اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہونچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پاکر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثتِ اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے :

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ	وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک
رَسُولًا مِّنْهُمْ (جمعہ ۔ ۱)	رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا ۔

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں،
(آل عمران ۔ ۱۲)	ان سب میں تم بہتر ہو ۔

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا :

فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ	تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر
تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ ۔	بھیجے گئے ہو، اور دشواری پیدا کرنے
(حدیث)	والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو ۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغامِ حق کی حامل ہے، اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے، وہ اس لئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت انجام دے، اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حجۃ الوداع میں اخیر حکم :

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ ۔	میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے، وہ
(حدیث)	اس تک پہونچا دے جو یہاں موجود نہیں ۔

صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک کے لئے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لئے یہ جاری و ساری ہے، فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہونچاتا چلا جائے ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے،

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ	تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت
طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ	میں سے چند اشخاص نکل جاتے تاکہ
وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا	دین (کا علم سیکھتے، اور اس) میں سمجھ
إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ.	پیدا کرتے، اور جب اپنی قوم کی طرف
	واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تاکہ
(توبہ - ۱۵)	وہ حذر کرتے

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی.

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گذر چکی ہے، جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے،

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ	قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں
لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	ان سب میں تم بہتر ہو، اچھی باتوں کو
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ	بتاتے ہو، اور بری باتوں سے روکتے ہو
بِاللَّهِ. (آل عمران - ۱۲)	اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو.

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ اس امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ

وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لئے سرفروشی کرے، اور اسی لئے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ	اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی
اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ	اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.	برے کاموں سے منع کرے، اور
(آل عمران - ۱۱)	یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت و تبلیغ میں مضمر تھی، جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کے آغوش میں اپنا نیا خون لے کر آئیں، اور اسلام کی صولت و شوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں، لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا، امت بانجھ ہو گئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا، مگر ان شاء اللہ یہ وعدہ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آکر اس فرض کو ادا کرے گی۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا	اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا
اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ	عذاب دے گا اور تمہاری جگہ اور لوگوں
وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئًا ۝	پیدا کر دے گا، جو خدا کے پورے

(توبہ - ۶) فرماں بردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہونچا سکو گے۔

پھر فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن	اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے
يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ	اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے
فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ	لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست
يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ	رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور
عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى	جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور
الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي	کافروں سے سختی سے پیش آئیں خدا کی
سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ	راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے
لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ	والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے
مَن يَشَاءُ۔ (مائدہ - ۸)	وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ اس سے اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہار حق میں کسی ملامت کی پروا نہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی

پوری تفصیل سورۂ حج کے آخر کی آیتوں میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا
وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُونَ ۝ وَجَاهِدُوا فِي
اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ
وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ
مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ
إِبْرَاهِيمَ ۚ هُوَ سَمَّاكُمُ
الْمُسْلِمِينَ مِنْ قَبْلُ وَفِي
هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا
عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى
النَّاسِ ۚ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ
وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا
بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ ۖ فَنِعْمَ
الْمَوْلَىٰ وَنِعْمَ النَّصِيرُ

(حج - ۱۰)

مومنو! رکوع کرتے رہو اور سجدہ کرتے رہو اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو، اور نیک کام کرو، تاکہ فلاح پاؤ اور خدا کی (راہ) میں جہاد کرو، جیسا جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تم کو برگزیدہ کیا ہے، اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی، (اور تمہارے لئے) تمہارے باپ ابراہیم کا دین (پسند کیا) اسی نے پہلے (یعنی پہلی کتابوں میں) تمہارا نام مسلمان رکھا تھا، اور اس کتاب میں بھی (وہی نام رکھا ہے) تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں، اور تم لوگوں کے مقابلہ میں شاہد ہو، اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور خدا کے (دین کی رسی) کو پکڑے رہو، وہی تمہارا دوست ہے،

اور کیسا اچھا دوست اور کیسا اچھا مددگار ہے۔

ان آیتوں سے اس شاہد اعظم اور مجتبائے عالم امت کے حسب ذیل آثار و علامات ہیں:

۱۔ ادائے نماز کی سختی سے پابندی کرنے والی۔

۲۔ ادائے زکوٰۃ پر عامل۔

۳۔ ایمان باللہ اور توکل علی اللہ سے پوری طرح مضبوط۔

۴۔ رکوع و سجود و عبادت الٰہی کی خوگر۔

۵۔ امور خیر پر حریص۔

۶۔ راہ حق میں جہاد اور فداکاری پر آمادہ رہنے والی۔

امت محمدیہ کے جس گروہ میں یہ علامات پائی جائیں گی وہی ان شاء اللہ تعالیٰ ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہوگا، جو اس کی بقاء اور قیام اور غلبہ و شوکت کے متعلق اوپر بیان ہوئی ہیں اور اسی سے حق تعالیٰ کا وعدہ ہے۔

قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ

کسی جماعت کو منظم بنانے اور اس کی حفاظت کے لیے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لیے ایک قوتِ عاملہ یا قوتِ آمرہ کی ضرورت فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے، اسی لئے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جا سکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو، انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا، جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا، پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی، تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا، ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گذاری کا صلہ سمجھنے کے بجائے اپنے غرور و استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا یا مافوق بشر قوی سے اپنے کو متصف قرار دیا، اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا، جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی۔ ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی، یعنی کوئی سورج دیوتا کا نورِ نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا، اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوتِ ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے، اور مصر کے فرعون اپنے کو رع یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے۔ ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام

زمانہ میں اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا) بننے کا دعویٰ کیا تھا، چین کے بادشاہ اپنے کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اسی لئے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغپور (خدا کا بیٹا) اور عربوں نے ابن ماء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا، یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو خدا کا اوتار کہتے تھے، ہومر کے بادشاہ (سونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے[1] اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس زمین میں جو سورج مطلع کہلاتی ہے، یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا خدا ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی روملس اور اس کا بھائی دونوں ستارہ مریخ کی اولاد تھے[2] ولادت مسیح کے پہلے سے سلاطینِ روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے اور ان کی پرستش کی جاتی تھی[3] یہودیوں میں حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو خدا کے کاہن اور خدا سے الہام پاکر خدا کے نام پر حکومت کرتے تھے، اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہی ہیں، ان ہی سب کے پیش نظر ارباب تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں، مثلاً اقتداری، شخصی، زعیمی، امرائی، دستوری، جمہوری۔

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع یازدہم، مضمون یونان [2] تاریخ روما، ص ۳، دار الترجمہ حیدرآباد دکن [3] ایضاً ص ۳۲۹

۱۔ اوتاری سے مفہوم تھیا کریسی ہے یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود خدا یا خدا کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی ہو اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

۲۔ شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت و اثر سے حکومت کرتا ہو، اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو، دنیا میں اکثر بادشاہ ایسے ہی گذرے ہیں۔

۳۔ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے، جیسی کبھی یونان میں تھی۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۵۔ زعیمی (آمرانہ) وہ طرز حکومت ہے، جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندہ کی حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے، مثلاً جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ ہی کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندہ تھے۔

۶۔ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لئے ایک مدت معینہ کے لئے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اسی کی ایک

صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی اصل ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیر اعظم پر ہوتی ہے، اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سکریٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے، جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے، اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر کی گئی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے سیاسی امراض کے لئے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کئے ہیں۔

اسلام کے طرز حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسیین یورپ نے اسلامی خلافت کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا، پہلے علماء جو شخصی حکومتوں کے خوگر ہیں اس کو شخصی بتاتے ہیں، نئے لوگوں نے انگریزی طرز کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتلایا، پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا، پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی، اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹر شپ) قوت پکڑ رہی ہے، اس کو زعیمی حکومت ثابت کرنے کے لئے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں، ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس میں بیک وقت مذہبی، شخصی، دستوری، جمہوری اور زعیمی حکومتوں کے خصوصیات اور مظاہر نظر آتے ہیں، اس لئے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظہور میں آیا، اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے، وہ نہ ادتاری ہے نہ شخصی ہے، نہ دستوری ہے، نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے، بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات و فضائل تو یکجا ہیں، لیکن وہ ان کے قبائح و معائب سے خالی ہے، اس لئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی، کبھی شخصی، کبھی زعیمی، کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے، لیکن اگر اس کو کامل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط و خال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے، مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے نہ خدا کا اوتار ہے، نہ خدا کا مظہر ہے، نہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے، نہ خدا سے براہ راست احکام پاتا ہے، نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے، نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، بلکہ وہ انسان ہوتا ہے، جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لئے اس کو منتخب کیا ہے، تاہم اسلام کی حکومت کو اس کاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ؐ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں،

اس کو الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے، اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل وعقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے، اس کو تسامحًا دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کی جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا، لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں، اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے، اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں، اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے، اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون وچرا عمل کرنا امت کے لئے ضروری ہے، اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر کہا جا سکتا ہے، لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات حکومت میں سے کوئی ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آسکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندے میں پھنس کر رہ گئی، اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے، اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین، ان کے فرائض وحقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں، اصل چیز حکومت کے امیر ورئیس اور ان کے ارکان وعمال کا تقویٰ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی

وایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جز کسی کی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں، بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے، اور اس کے حکم یا منشاء حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے، اور خدا کے بنائے ہوئے اور تعلیم کئے ہوئے احکام وفرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے، اور سب ہی اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین وحکام اور سلطنت کے اہالی کے قول وفعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہیں کہ وہ حق وعدل کے خلاف نہ کر سکیں، لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا نقش بٹھاتی ہے، تاکہ تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں۔ عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں، پھر تیسرا اور چوتھا قانون، پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لئے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں، اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں، اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا، اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقویٰ اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی ہر کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے، جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت، زمانۂ خلافت اور بعض نیک وعادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ امت میں کامل ایمان اور

عملِ صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے، اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے، جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ یا سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جارہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے، اسی طرح اس اسلامی نظامِ حکومت کی برقراری کے لئے بھی سب سے پہلے اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کے اجراء کی حاجت ہے۔

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ :

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (انعام ۷) حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔

آیتِ بالا میں ارشادِ خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں مگر اللہ کا ہے، اس لئے اسلام میں حاکمِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن احکامِ الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں، اور دوسرے تکوینی یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقاتِ عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری و ساری ہے۔ دنیا میں ایسے بادشاہ گذرے ہیں جنھوں نے نمرود و فرعون بن کر دعوائے بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکامِ الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہہ ان سلاطینِ عالم کو اس لئے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک و شبہہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی، زمین سے

آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے، اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ فیصلہ ہے، اس معنی کی قرآن پاک کی کئی آیتیں ہیں۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ (یوسف-۸)	حکم نہیں، مگر اللہ کا۔
اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِيْنَ (انعام - ۰)	ہاں! اسی کے لئے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔
لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ (قصص-۹)	اسی کا کام کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤگے۔

امر تکوینی وفطری میں تو انسان کی ناچاری ومجبوری ظاہر ہے وہ زمین، آسمان اور خاک وباد وآب وآتش اور جسم وجان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کرسکتا، نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے، نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے اور نہ ان کے قواعد وقوانین میں ایک ذرہ کی کمی واضافہ کرسکتا ہے، خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعوی کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کردیا، فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ يَأْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ (بقرہ - ۳۵)	تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو تو اس کو پچھم سے نکال، تو وہ کافر لاجواب ہوگیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ (اٰلِ عمران - ۳)

اے اللہ سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے۔

اس لئے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام تکوینی کی طرح اس کے احکام تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لئے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں، اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجراء اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، البتہ اس نے اپنی شریعت میں احکام اور قوانین میں جو کلیات اور قواعد بیان فرمادیئے ہیں، ان کے تتبع سے اہل علم اور مجتہدین دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کر سکتے ہیں۔

ان احکام الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع و ضرر پر مشتمل ہوں، بے شبہہ اہل عقل اپنی عقل و فہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں، لیکن شریعت میں احکام کا مدار صرف اسی حیثیت پر نہیں ہے، بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے، یا یوں کہئے کہ کس فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب مرتب ہوتا ہے، اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور اسکے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہو سکتا ہے، اہل عقل اپنی ناقص عقل سے

جو کچھ کہتے ہیں، اگر وہ علم الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لئے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے، اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے، اس لئے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا۔

ان تمام مذکورہ بالا امور کے لحاظ سے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ قانون کا حاکم اور امر و نہی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں ادا کیا گیا ہے، عام طور سے فقہاء نے اس پر ان دو آیتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ (انعام۔، یوسف۔ ۸)	حکم صرف اللہ کے لئے ہے۔
۲۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ۔	ہاں اسی اللہ کے لئے ہے پیدا کرنا
(اعراف ۷)	اور حکم دینا۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادث عالم سے متعلق ہے، پہلی آیت دو جگہ ہے، سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں، سورۂ انعام کا موقع یہ ہے کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے، اس کے جواب میں ہے:

مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ	جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو، وہ
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ يَقُصُّ الْحَقَّ	میرے پاس نہیں، حکم کسی کا نہیں بجز

وَهُوَ خَيْرُ الْفَاصِلِيْنَ ۔	اللہ تعالیٰ کے، اللہ تعالیٰ واقعی
	بات بتلا دیتا ہے اور وہی سب سے
(انعام - ۷)	اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے ہیں، کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ چاہتا ہے۔

وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ	اور خدا کے حکم کو میں تم سے ٹال
شَيْءٍ ، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَيْهِ	نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے
تَوَكَّلْتُ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	(باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اسی
الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۔	بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ
(یوسف - ۸)	رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہئے۔

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ	بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ	سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں
سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى	پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا
عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ	دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ
النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ	وہ شب اس دن کو جلدی سے آ لیتی ہے،

وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (اعراف-۷)

اور سورج اور چاند اور دوسرے سیاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے خاص ہے خالق ہونا اور حکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق و تکوین سے ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ لفظ اَمر اور حکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں لیکن قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر صرف اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

عبادت کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ (مریم-) شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

أَنْ لَا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ (یٰسین-۴) یہ کہ شیطان کی عبادت نہ کرو۔

اوپر کی آیتوں سے واضح ہوا کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، یہاں سوال پیدا ہوتا ہے تو پھر اسلام میں انبیاء اور ائمہ زمانہ اور خلفاء کی اطاعت کا حکم کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، جواب یہ ہے کہ بے شبہ اسلام میں اطاعت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، لیکن دوسروں کی اطاعت احکام الٰہی کی تبلیغ، اجراء اور تنفیذ کے لئے حکمِ الٰہی کے تحت ہے، ارشاد الٰہی ہے:

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی
وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔	اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولوالامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام، خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجراء میں ہے۔ اور رسول کی اطاعت بھی احکام الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (نساء - ۱۱)	اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (نساء - ۹)	اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا، اور ان کا حکم حکم خدا سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور پر

بجا لایا جاتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا مجرم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ	اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو
بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا	اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے
يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ	اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے
وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ	حرام کیا اس کو حرام مانتے ہیں اور
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ.	نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہل کتاب پر اللہ پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے، وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند نہیں ہیں، بلکہ یہ مرتبہ انھوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے، چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ	اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے اور
ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا	مریم کے بیٹے مسیح کو، حالانکہ ان کو
لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا.	صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود
(توبہ - ۵)	برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ وہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے، کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو

غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے، اسلام نے اہلِ کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی۔

يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ	اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف
سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ لَّا نَعْبُدَ	جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں
اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا	مانی ہوئی ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی
وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا	کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔	کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک خدا
(آل عمران۔ ۷)	کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے، ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتمؓ جو ایک عیسائی عرب امیر تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ نے ان کے سامنے سورہ توبہ والی آیت مذکور پڑھی، تو عدی نے کہا "وہ ان کو معبود نہیں بناتے" فرمایا کیوں نہیں، انھوں نے ان کے لئے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انھوں نے ان کے احکام کو مانا، یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے، الفاظ یہ ہیں فذالک عبادتہم ایاھم[۱] ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے، لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے تو یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے، یہی تو شرک ہے۔[۲]

---

۱ تفسیر ابن کثیر، ۲ ترمذی تفسیر آیت توبہ

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں، بلکہ خدا کا ہے اور اسی کا نام وضع حکم ہے، اس تحلیل و تحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے، اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکم خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الٰہی کی سختی سے بچنے کے لئے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لیجاتے تھے یا ان کے فیصلہ کے لئے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر و توبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا، چنانچہ بعض اصولی احکام عدل و انصاف اور طریق اطاعت احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ	کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے
اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ	ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا
اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ	اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا، ایمان لاچکے
اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ	ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا
وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۔	حاکم بنائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ
(نساء ۔ ۹)	وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے، "کل معبود من دون اللہ"۔ اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہن، جادوگر، اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے، اس لئے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ

اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے، وہ طاغوت ہے، قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے، اور ہر جگہ اس سے مراد حکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے، اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ	اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے
هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (مائدہ - ۷)	رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے، حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے بڑھنے کی جرأت گناہ اور عصیان ہے، اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں، اور ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے، قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الٰہی کے بیان کے بعد ارشاد ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ	یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں، جو
حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ	ان حدوں سے آگے بڑھے گا وہ
(طلاق - ۱)	اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ	یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ
اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ	اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ	اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا،
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ	جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اسی میں
الْعَظِيْمُ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ	ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بڑی کامیابی ہے
وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ	اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی
يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا	کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے
وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ.	بڑھے گا، اس کو وہ دوزخ میں داخل کریگا
	جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور
(نساء - ۲)	اس کے لیے بڑی ذلت کی سزا ہے.

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ ورسول کی اطاعت اور اس کی جزا جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ اور رسول کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے، اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔

قانون وشرع کی حقیقت تحلیل وتحریم ہی ہے، اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلا سند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرام کہہ لے تو اس کا نام افترا علی اللہ خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے، ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ	اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے احکام

هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ	و حرام) بتاتے ہو، ان کی نسبت یہ
لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ	نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ
اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ	تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ، یہ (دنیا
الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ مَتَاعٌ	میں) چند روزہ فائدہ ہے، اور
قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (نحل ۱۵)	ان کے لئے دردناک عذاب ہے

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال و حرام کی شریعت کو اپنے لئے مخصوص فرمایا بلکہ یہ بھی پیشین گوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے، گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے مگر وہ ان کے لئے عذاب ہی ثابت ہوگا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکام الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے، اور اس حیثیت سے آپ کا ہر حکم حکم الٰہی ہے، لیکن حکم الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ نے ایک چیز کو اپنے لئے حرام قرار دیا تو عتاب الٰہی آیا:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ	اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے
لَكَ ۚ (تحریم - ۱)	جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں، حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کر دے، مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ کو منع فرمادیا، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے

دو نقصان تھے، ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لئے مخصوص نہ ہو امت کے لیے حکم الٰہی کے تحت شرع کا حکم رکھتا ہے، اس قاعدہ کی بنا پر آپ کے اس ترک سے امت اپنے لیے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی، دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذن الٰہی کے بھی حقِ تشریع ہے، جو صحیح نہ ہوتا، اسی لئے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعت الٰہی کا مبلغ اور قانون ربانی کا شارح اور مظہر ہے، قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ۔ (توبہ - ۴) — اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے، وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے، رسول کی اطاعت عین اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے، کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے اصول کا مسئلہ بن گیا ہے، چنانچہ علم عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضع قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انہ لا حاکم سوی اللہ تعالیٰ — جاننا چاہیے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا

ولاحکم الا ما حکم به، و	کوئی نہیں، اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ
یتفرع علیه ان العقل	نے حکم فرمایا ہے، اور اسی اصل مسئلہ پر یہ
لا یحسن ولا یقبح ولا یوجب	متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا
شکر المنعم وانه لا حکم	کہتی ہے نہ برا، اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً
قبل ورود الشرع.	نہیں ہے، اور یہ شرع کے ورود سے
(۱، ۱۱۳ مصر)	پہلے کوئی حکم نہیں.

مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے، اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون قانون ہے، اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض، واجب، سنت، مستحب یا حرام، ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عقاب کا حکم عائد کیا جا سکے، نہیں ہو سکتا. اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے. علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی سنہ ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاکم لا خلاف فی انه	اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع
رب العلمین. (ص ۲-۸۹)	پروردگار عالم ہے.

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں:

"حسن و قبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو نظر

پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے، جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا بُرا، تیسرے اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نقص کی، جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے، ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی فعل پر عذاب کے مترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے، اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے صرف شرع پر موقوف نہیں، اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے، اور اس فیصلہ کے لیے حکم الٰہی کے ورود کا انتظار نہیں کیا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی رعایت (لحاظ کرنا) واجب ہے، شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔"

(ص ۹۰ بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے، حق یہ ہے کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے اور عقل سے اس کی مصلحت، قیاس و تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک منضبط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہلسنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے،

مولانا محب اللہ بہاری المتوفی سنہ ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

"الحکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت کے موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے، اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مدح یا مذمت کا مستحق ہونا عقل کے

روسے سمجھا جاسکتا ہے یا صرف شرع سے؟ تو اشاعرہ کے نزدیک صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا وہ اچھا ہے اور جس کو بُرا فرمایا وہ بُرا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا بُرا ہوتا، اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اس کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے، وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے، لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے، کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا" (المقالۃ الثانیۃ فی الاحکام)

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے ہیں مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

"اس مسئلہ پر کہ حکم صرف اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے اور ہمارے مشایخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے، اور معتزلہ کے نزدیک واضع قانون وحاکم عقل ہے، یہ غلط ہے، کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہو سکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ عقل بعض احکام الٰہی کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو، اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے"

قاضی شوکانی المتوفی سنہ ۱۲۵۰ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف

اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے:

"اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہونچنے کے بعد حاکم قانونی صرف شرع ہے، اختلاف اس زمانہ یا حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہونچی ہو، تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے نہ ایمان واجب ہے، اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکم الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔"

(ص ۱۲، ارشاد الفحول، مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسمٰعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ کا وہ قول فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

"اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لئے ہے پیدا کرنا، حکم دینا، عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم کو ثابت کرے، اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے، عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر، اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے، تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ متصف ہونا امر و نہی سے پہلے علم الٰہی میں حقیقت میں ہو چکا تھا، اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے، عقل کبھی ان کے حسن و قبح کو معلوم کر لیتی ہے، تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں، لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا تو یہ مذکورہ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں تمام تر اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے پس احکام بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں (ص ۱۰)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب[1] ہے۔ اس میں اس فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں سمیٹ دیا ہے، اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ "قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے" یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لئے ثابت نہیں ہے، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے وہ تمام تر حکمت اور بندوں کی مصلحت پر مبنی ہے، عقل کبھی اس حکمت و مصلحت کو پالیتی ہے تو اس کو عقلی بھی کہہ سکتے ہیں، ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور محرک ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شروع سے اخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضع قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، وہی ایک حاکم، آمر اور واضع شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں نازل ہوا، وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لئے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول، اور کلیات' اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات، دنیا کے ہر قانون کے اصول و کلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا تغیر و تبدل اور تجدد (یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا) یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے

[1] تہذیب منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا ہے۔

جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول و کلیات پرانے اور غیر متبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لئے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا، اور اب بندوق سے، تمنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولے سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے، لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہونچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائکلوں، اسکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آجائیں، یا نقصان پہونچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دوسرا شبہہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول و فروع پر پوری نگاہ رکھتے ہوں، آیات و احادیث کے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں، اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضع اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام الٰہی کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے، اہل اصول کے

اس مسئلہ کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے، یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزئیہ فلاں اصول کلی کے ماتحت ہے، انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہاء نے فتاوی کا پورا دفتر مرتب کیا ہے، جس کے مطابق ہر زمانہ تک ہر ضرورت کا جواب دیا جاسکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

فاضل مصنف کی دوسری کتابیں

سیرۃ النبیؐ جلد سوم: معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث، قیمت ۵۵-۰۰

سیرۃ النبیؐ جلد چہارم: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض، " ۵۵-۰۰

سیرۃ النبیؐ جلد پنجم: فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد پر سیر حاصل بحث، " ۲۵-۰۰

سیرۃ النبیؐ جلد ششم: اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل " ۵۵-۰۰

رحمتِ عالمؐ: مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے بچوں کے لیے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ " ۶-۰۰

خطباتِ مدراس: سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانانِ مدراس کے سامنے دیے گئے تھے، " ۱۳-۰۰

سیرۃ عائشہؓ: حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات و مناقب و فضائل، " ۲۳-۰۰

حیاتِ شبلیؒ: مولانا شبلی کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری، " ۵۵-۰۰

ارض القرآن جلد اول: قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی ارضی و تاریخی تحقیق، " ۲۱-۰۰

ارض القرآن جلد دوم: بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان " ۱۵-۰۰

مقالاتِ سلیمان اول: ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین " ۳۰-۰۰

مقالاتِ سلیمان دوم: تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ، " ۲۶-۰۰

مقالاتِ سلیمان سوم: مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ " ۲۶-۰۰

خیام: خیام کے سوانح و حالات، اور اس کے فلسفیانہ مسائل کا تعارف " ۴۰-۰۰

عربوں کی جہازرانی: بمبئی کے خطبات کا مجموعہ، " ۱۴-۰۰

عرب و ہند کے تعلقات: ہندوستانی اکاڈمی کے تاریخی خطبات طبع دوم عکسی " ۴۶-۰۰

یادِ رفتگاں: ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے متعلق سید صاحب کے تاثرات، " ۲۰-۰۰

"منیجر دار المصنفین"